

بیوقوف

مزاحیہ اردو ناول

”خادم حاضر ہو سکتا ہے۔“ قیصر نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔
شہناز الماری صاف کرنے کے لیے تمام کتابیں نکال نکال کر ایک طرف ڈھیر کرتی
رہی تھی۔

”اگر جناب کی آمد میری اجازت پر منحصر ہے“ شہناز نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے
ب دیا۔ ”تو ہرگز نہیں۔“

”شکریہ۔ شکریہ۔“ قیصر نے قدم بڑھا کر قریب آتے ہوئے کہا۔ ”آداب بجا لاتا
ہے۔“

”پلیز قیصر صاحب۔“ شہناز جیسے گھبرا کر بولی۔ ”آپ کو اگر کوئی چیز بجانا ہے تو امی کے
کمرے میں جائیے۔ وہ ہر قسم کے ساز بڑے شوق سے سنتی ہیں۔ میرے سر میں پہلے ہی درد
رہا ہے۔“

”لاؤ سردیادول۔“

”میرا سردبانے کے بجائے اپنا گلا نہیں دبا سکتے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔“

”گویا گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے۔“

”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ آپ کسی چیز یا گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔“ شہناز نے جواب

دیا۔ ”بہر حال افسوس ہے کہ آج کل ہمارے یہاں کوئی پنجرہ خالی نہیں۔“

”دل کے پنجرے میں قید کر لو۔“ قیصر معنی خیز لہجہ میں بولا۔

”بیکار ہے۔“ شہناز نے سر ہلایا۔ جن کو حوالات کی عادت پڑ چکی ہو، پنجرے میں

میں رہ سکتے۔“

اچانک ملازمہ گلشن کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”بی بی جی۔“ اس نے شہناز سے کہا۔ ”بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔“
 ”اللہ تیرا شکر ہے۔“ شہناز نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم جاؤ میں آ رہی ہوں۔“
 گلشن ایک نظر قیصر پر ڈالتی ہوئی واپس چلی گئی۔ شہناز نے ہاتھ کی کتابیں میز پر رکھیں
 دروازے کی طرف چلی۔

”آئیے مسٹر۔ میں کمرابند کر رہی ہوں۔“ اس نے پلٹ کر قیصر سے کہا۔
 ”واپس تو آؤ گی نا؟ میں یہیں انتظار کرتا رہوں گا۔“
 ”امی شاید مجھے کسی کام سے بازار بھیجنا چاہتی ہیں۔“ شہناز نے جھوٹ بولا ”والہی
 شام بھی ہو سکتی ہے۔“

”پھر تو ساتھ چلنے کا بڑا اچھا موقع ہے۔“ قیصر جلدی سے باہر آ گیا۔
 ”سامان اتانا نہیں ہو گا کہ قلی کی ضرورت پڑے۔“ شہناز نے دروازہ بند کر کے
 لگا دی۔

”کار کا ڈرائیور سی۔“ قیصر نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔
 خالہ جان سے مت کہنا کہ میں آیا تھا۔“
 ”مجھے ضرورت نہیں پڑے گی۔ گلشن پہلے ہی دیکھ گئی ہے۔“
 ”مارے گئے۔ میں آج پھر ان کا چشمہ بھول آیا ہوں۔“
 ”تو کیا ہوا۔ ایک جھوٹ اور سی۔“ شہناز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
 ”خیر یہ تو اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر خطرہ یہ بھی تو ہے کہ وہ پکڑ کر بٹھالیں گی۔“
 ”بھئی میں تو باہر ہی انتظار کرتا ہوں۔“ قیصر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔
 شہناز اپنی امی کے کمرے میں داخل ہوئی۔
 ”آپ نے بلایا تھا امی۔“ اس نے پوچھا۔ بیگم شاکر نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھا
 اسے دیکھا اور پھر اس کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔
 ”گلشن کہہ رہی تھی کہ قیصر آیا ہے۔“ انہوں نے گلشن کی طرف دیکھا جو کمرے کے
 فرش پر پچارا کر رہی تھی۔

”جی ہاں۔ آئے بھی تھے اور چلے گئے۔“ شہناز نے جواب دیا۔

”میرا چشمہ دے گیا۔“ بیگم شاکر نے پوچھا۔

”جی چشمہ ہی تو انہیں واپس لے گیا ہے۔ ورنہ وہ اتنی جلدی جانے والے کہاں

تھے۔“ شہناز بولی۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ اتنا غیر ذمے دار لڑکا ہے۔ بیگم شاکر ناگواری سے بولیں۔

”بھلا بتاؤ تو پندرہ دن ہو گئے ہیں کیا اب تک ذرا سا فریم مرمت نہیں ہو سکا ہو گا۔ وہ تو

غیبت ہے کہ میرے پاس دوسرا موجود تھا ورنہ گھر کے کام کاج سے بھی جاتی رہتی۔“

انہوں نے ناک پر رکھا ہوا چشمہ درست کیا اور دوبارہ اخبار کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا امی۔“ شہناز نے پھر پوچھا۔

”اے ہے۔“ بیگم شاکر نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ”میں بھی کیا ہوں۔ تم اس وقت کیا

کر رہی ہو بیٹی۔“

”پرسوں کالج کھلنے والا ہے نا۔ ذرا اپنی کتابیں وغیرہ ٹھیک کر رہی تھی۔“

”کتابیں پھر ٹھیک کر لیتا۔ ذرا جلدی سے اپنے ابو کے برابر کا کمر اکھلوا کر صاف کرا

دو۔ شاباش۔“ بیگم شاکر نے کہا۔

”کون آرہا ہے امی۔“ شہناز نے دلچسپی سے پوچھا۔

”عدنان۔“ بیگم شاکر نے اس طرح جواب دیا جیسے شہناز عدنان کے بارے میں سب

کچھ جانتی ہو۔“

”یہ کون بزرگ ہیں امی۔“

”بزرگ۔“ بیگم شاکر کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ ”بیٹی تمہارے ابو کے ایک

دوست عرفان علی صاحب مرشد آباد میں رہتے ہیں۔ عدنان ان کے بڑے بیٹے کا نام ہے۔“

”اوہ! تو وہ یہاں کس لیے آرہے ہیں۔“

”کسی کام سے ہی آرہا ہو گا۔“ بیگم شاکر نے اخبار کے پیچھے اپنی معنی خیز مسکراہٹ

چھپانے کی کوشش کی۔ ”تم جلدی سے اس کے لیے کمر اٹھیک کر دو۔ تمہارے ابو اسے

لینے اسٹیشن گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔ مجھے خیال نہیں رہا ورنہ کل گلشن سے کرا لیتی۔“
”تو گویا اب وہ نہیں کر سکتی۔“ شہناز نے منہ بسورا۔

”کر سکتی ہے۔ مگر جو کام وہ دو گھنٹے میں کرے گی تم اسے آدھے گھنٹے میں کر دو گی۔“ بیگم شاکر نے نرمی سے سمجھایا۔

”پھر میں یہ تو نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم اپنے ہاتھ سے صفائی کرو۔ گلشن کو ساتھ لے جاؤ بس ذرا اس کے سر پر کھڑی رہنا۔“

شہناز کو برا تو بہت لگا مگر ماں کا حکم تھا ماننا پڑا۔ پھر بھی مارے غصے کے گلشن کو ساتھ نہیں لے گئی۔ بیگم شاکر نے بعد کو بھیجا بھی تو دروازے سے واپس کر دیا۔ ”خبردار جو کسی چیز کو ہاتھ لگایا تو نے ہاتھ توڑ دوں گی۔ چل بھاگ یہاں سے۔“ شہناز نے جھاڑو لہرائی۔

گلشن بھاگی تو برآمدے میں قیصر سے ٹکرا ہو گئی۔

”شہناز کہاں ہے۔“ قیصر نے اس نعمت غیر مترقہ سے محفوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔
”وہ تو ابھی کوٹھی کے پچھلے حصے سے نکل کر بازار چلی گئی ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا۔“

گلشن قیصر سے بہت جلتی تھی۔

”کیوں جھوٹ بول رہی ہو۔ وہ پیدل تو جانے سے رہیں اور گیراج کے پاس میں کھڑا ہوا تھا۔“

”کار بڑے صاحب لے گئے ہیں۔ شہناز بی بی ٹیکسی سے چلی گئیں۔“ گلشن نے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

”اگر پیدل گئی ہیں تو پکڑا جاسکتا ہے۔“ قیصر نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

کمر کافی دنوں سے بند پڑا تھا۔ شہناز صفائی کر کے فارغ ہوئی تو گرد میں اٹی ہوئی تھی۔ باہر نکلی تو شاکر حسین صاحب عدنان کو ساتھ لیے چلے آ رہے تھے۔ شہناز نے دیکھا ایک گورا چٹا گھونگریا لے بال اور نیلی آنکھوں والا خوبصورت نوجوان اس کے ابو کے پیچھے ایک سوٹ کیس اٹھائے کھڑا ہے۔ شہناز کو دیکھتے ہی اس نے سوٹ کیس زمین پر رکھ دیا۔

”اے لڑکی۔“ وہ بڑے کھردرے لہجے میں بولا۔ ”یہ سوٹ کیس اٹھا کر اندر لے

چلو۔“

”شہناز کو بڑا غصہ آیا مگر باپ کے سامنے کچھ بول نہ سکی۔ تیزی سے پلٹ کر غسل خانے کی طرف بھاگ گئی۔

”انکل۔“ معلوم ہوتا ہے آپ نے ملازموں کو بڑا سرچڑھا رکھا ہے۔“ بھاگتے ہوئے شہناز نے سنا۔ ”مگر آپ دیکھیے گا کہ میں ایک ہفتہ بھی یہاں رہ گیا تو سب کو ٹھیک کر دوں گا۔“

شاکر حسین صاحب نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔

”ضرور بھی ضرور۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”خاص طور سے اس چڑیل کو اگر ٹھیک کر سکو تو بڑا اچھا ہو گا۔ اس نے ہم سب کا ناک میں دم کر دیا ہے۔“

شہناز نے جھلا کر ہاتھ روم کا دروازہ بند کر دیا۔ بڑا آیا وہاں سے ٹھیک کرنے والا۔ اس نے پانی کی ٹوٹی کھولتے ہوئے سوچا۔ دل تو نہانے کو چاہ رہا تھا مگر ابھی اسے اپنا کمرابھی درست کرنا تھا۔ شہناز منہ ہاتھ دھو کر ہاتھ روم سے باہر نکل آئی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے امی کے کمرے کے کھلے دروازے سے باتیں کرنے کی آوازیں سنیں۔ ”تو جناب امی کو بھی باتوں سے رام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ اس نے دل میں کہا اور جلدی سے دروازے کے سامنے سے گزر گئی۔

تولیہ سے منہ خشک کر کے شہناز نے الماری صاف کی اور نئے کاغذ بچھا کر کتابیں قرینے سے لگانے لگی۔ ابھی پانچ دس کتابیں ہی رکھی تھیں کہ کمرے کے دروازے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ شہناز نے گھوم کر دیکھا تو اس کی امی اسی نوجوان کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

”شہناز بیٹی۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ انہیں سلام کرو۔ یہ عدنان ہیں۔“

”شہناز نے عدنان کی طرف دیکھے بغیر ماتھے پر ہاتھ پھیر دیا مگر اسے احساس تھا کہ عدنان اسے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔

”جیجی یہ بے چاری تو گونگی ہیں۔“ اس نے کہا۔ شہناز تلملا کر رہ گئی۔
 ”السلام علیکم۔“ وہ زور سے بولی اور گھور کر عدنان کی طرف دیکھا۔
 ”مجھے معلوم تھا کہ آپ چھپر بھاڑ کر بول انھیں گی۔“ عدنان کا لہجہ بڑا پتھتا ہوا تھا۔
 ”عورت کبھی گونگی ہونے کا الزام برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ اس کی فطرت کے منافی
 ہے۔“

وہ بیگم شاکر سے مخاطب ہوا۔
 ”تو یہ ہیں آپ کی بیٹی شہناز۔ میں تو انہیں ملازمہ سمجھتا تھا۔ ویسے امی برا نہ مانیں یہ
 لگتی تو بالکل نوکرانی ہیں۔ وہ جو آپ کی ملازمہ ہے نا گلشن، اسے ذرا سلیقے کے کپڑے پہنا
 دیئے جائیں تو ان سے اچھی ہی ہوگی۔“
 شہناز کی جان جل گئی۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنی غلطی پر
 شرمسار ہوتے، معافی مانگتے، جناب اکڑے ہی چلے جاتے ہیں۔ آخر انہیں حق کیا ہے میری
 شکل و صورت پر تنقید کرنے کا۔“

کپڑے تو آپ نے بھی سلیقے سے پہن رکھے ہیں۔“ شہناز نے چوٹ کی۔
 ”آہا! دیکھیے محترمہ بس یہی فرق ہوتا ہے۔“ عدنان نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔
 ”کیا مطلب؟“ شہناز چوٹ کی۔

”میں نے سلیقے کے کپڑے کہا تھا۔ آپ نے کہا سلیقے سے پہن رکھے ہیں۔“ عدنان
 نے جواب دیا۔ ظاہر ہے کپڑے پہننے کا سلیقہ ہر کس و ناکس میں نہیں ہوتا ہے جبکہ سلیقے
 کے کپڑے امی کی مہربانی سے گلشن کو بھی مل سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں آپ نے ”کے“ اور
 ”سے“ کے درمیان فرق نہ کر کے جہاں اپنی قابلیت کا اظہار کیا ہے وہاں وہ طنز بھی بے معنی
 کر دیا ہے جو آپ مجھ پر کرنا چاہتی تھیں۔“

تو اب جناب مجھ پر اپنی قابلیت کا رعب بھی جمانے لگے۔ شہناز نے دل میں کہا۔
 ”آپ کا مطلب ہے کہ ملازموں میں سلیقہ نہیں ہوتا۔“ بظاہر اس نے پوچھا۔
 ”جی نہیں۔ ہوتا بھی ہے۔“ عدنان نے سرسری لہجہ میں کہا۔ ”خاص طور سے ان

میں جنہیں سلیقہ شعار گھروں میں کام کرنے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ آپ کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ذرا محنت اور شوق سے کام کرتی رہیں۔“
 ”دیکھ رہی ہیں۔“ شہناز نے ہار کر ماں سے شکایت کی۔
 ”تم دونوں نے تو ملتے ہی ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا۔“ بیگم شاکر مسکراتے لگیں۔

”ارے نہیں امی۔ یہ تو میں نے شہناز صاحبہ کی بات کے جواب میں ایک بات کہہ دی تھی۔“ عدنان بولا۔ ”میں چھوٹی بچیوں سے نہیں لڑا کرتا۔“
 ”میں چھوٹی بچی نہیں ہوں۔“ شہناز چڑ گئی۔ ”بائیس سال کی عمر ہے میری بی اے فائنل میں پڑھتی ہوں۔“
 ”صرف بی اے۔“ عدنان نے منہ بتایا۔

”جیسے آپ بہت ایم اے پی ایچ ڈی ہیں۔ شہناز نے جھلا کر جواب دیا۔
 ”شہناز۔“ بیگم شاکر نے ڈانٹا۔ ”کیا بد تمیزی ہے۔ نہ چھوٹا دیکھتی ہو نہ بڑا۔ زبان چلانے لگتی ہو۔“

”چھوٹیے امی۔“ عدنان نے جیسے بڑی بوری سے کہا۔ ”آپ مجھے میرا کمراتا دیجئے۔“

”میں غسل کر کے ذرا دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔“
 ”سفر بھی تو اتنا لمبا ہے۔“
 بیگم شاکر نے ہمدردی سے کہا اور بیٹی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کمر تو تم نے ٹھیک کر دیا ہو گا۔“

”ہاں کر دیا ہے۔“ شہناز کا منہ ماں کی ڈانٹ سن کر پھول گیا تھا۔
 ”اور جیسا کیا ہو گا اس جواب سے ظاہر ہے۔“ عدنان نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔
 ”خیر خود ہی ٹھیک کر لیں گے۔ ہاں امی۔“ وہ بیگم شاکر کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”آپ کے یہاں ناشتا اور کھانا وغیرہ کون تیار کرتا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”اپنی نگرانی میں گلشن سے تیار کراتی ہوں۔“ بیگم شاکر بولیں۔

”کیوں؟ کیا شہناز گھر کا کام نہیں کرتی۔“

”یہ ضرور کریں گی۔ کبھی باپ ایک پیالی چائے مانگتے ہیں تو ان کا منہ پھول جاتا ہے۔“

”توبہ توبہ! یہ آج کل کی لڑکیاں۔“ عدنان نے ترشی سے کہا۔ ”کالج میں کیا پڑھنے لگتی

ہیں معلوم ہوتا ہے والدین پر کوئی احسان عظیم کر رہی ہیں۔ مجال ہے گھر کے کسی کام کو ہاتھ

تو لگالیں۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹے۔“ بیگم شاکر نے تائید کی۔ ”اچھا آؤ میں تمہیں کمراد کھا

دوں۔“

بیگم شاکر عدنان کو ساتھ لے کر باہر چلی گئیں۔ شہناز اپنے غصے کو بڑی مشکل سے ضبط

کرتے ہوئے دوبارہ الماری کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تو یہ ہیں عدنان صاحب۔ اس نے بڑی نفرت سے سوچا۔ اللہ میاں نے ذرا اچھی

صورت کیا دے دی ہے کہ مارے غرور کے اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ اچھا ہی

ہوا جو پرسوں سے کالج کھل رہے ہیں۔ ورنہ یہ کہیں چھٹیوں میں نازل ہو جاتے تو دو مہینے

کاٹنا مصیبت بن جاتے اور یہ بھی اچھا ہے کہ ابو کے برابر کا کمران حضرت کو دیا گیا ہے۔

باہر آتے جاتے بڑے بھیڑ ہونے کا اندیشہ بھی نہیں۔ بس خدا کرے جلدی سے دال نے عین

ہو جائیں۔“



اس کا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا کہ لڑکے خواہ مخواہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس فیشن کے زمانے میں اٹھارہ انچ پائینچے کی چٹلون اور وہ بھی سینے سے کچھ نیچے بندھی ہوئی۔ ڈھیلا ڈھالا کوٹ جس کی آستینیں اتنی بڑی کہ ہتھیلیاں باہر رکھنے کے لیے انہیں چٹلون کے پائینچے کی طرح موڑ دیا گیا تھا۔ تیرا کندھوں سے نیچے لٹک رہا تھا اور چونکہ آستینیں ڈھیلی تھیں اس لیے یہ پتا لگانا مشکل تھا کہ ہاتھوں اور بقیہ جسم کا ملاپ کہاں ہوا ہے۔ چشمے کے بغیر دیکھا جاتا تو چہرہ اچھا خاصا بلکہ کتنا چاہیے کہ خوبصورت تھا مگر اس کا کیا علاج کہ ڈھیلے حل بل خولا کپڑوں نے جو کسریاں چھوڑی تھیں وہ تیل چڑے ہوئے بالوں، بڑی بڑی اور بالکل احمقوں جیسی پھیلی پھیلی بھوری آنکھوں نے پوری کردی تھی اور آنکھیں بھی ایک عدد بھاری بھر کم چشمے کے ساتھ جو ناک کے آخری سرے پر محض رکھا ہوا نہیں بلکہ چپکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

ماڈرن کالج کے گیٹ پر بھاری بھر کم بورڈ کے نیچے کھڑے ہوئے دو تین لڑکوں نے بڑی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ گزشتہ پانچ منٹ سے بجلی کے کھمبے کے قریب کھڑا کبھی سر کھجانے لگتا اور کبھی کان۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بار بار کوئی ارادہ کر رہا ہے مگر اس پر عمل کرنے کی ہمت نہیں پاتا۔ آخر اس نے کچھ ڈرتے ڈرتے لڑکوں کی طرف قدم بڑھائے۔

”السلام علیکم۔“ وہ قریب آکر بولا۔

”وعلیکم السلام۔“ ایک لڑکے نے جواب دیا۔

”ماڈرن کالج یہی ہے نا۔“ اس نے پوچھا۔

”آپ نے یہ لمبا چوڑا بورڈ نہیں دیکھا۔“ جواب دینے والے کے چہرے پر طنزیہ

مسکراہٹ آگئی۔

”بورڈ تو پڑھا تھا مگر۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”مگر پڑھنا نہیں آتا۔“ دوسرے لڑکے نے بات پوری کرنا چاہی۔

”جی یہ بات نہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”ابھی تین چار دن پہلے ایک جگہ اس سے بھی بڑا بورڈ دیکھا۔ لکھا تھا کہ اپنی بچائی ہوئی رقم ڈاک خانے میں جمع کرائیے۔ میں گھر سے کچھ لفافے خریدنے نکلا تھا، ڈاک خانہ سمجھ کر بورڈ کے پیچھے جھانکا تو میونسپل کارپوریشن کا پیشاب گھر نظر آیا۔“

”اور آپ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اس بورڈ کے پیچھے بھی کوئی گیرج یا ہیر کٹنگ سیلون نہ نکل آئے۔“ تیسرے لڑکے نے ایک تہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”واقعی یہ پبلٹی بورڈ بڑا دھوکا دے جاتے ہیں۔ بہر حال اطمینان رکھیے یہ کالج ہی ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس سے کام کچھ اور لیا جا رہا ہے۔“

”آپ کو کالج میں کسی سے ملنا ہے۔“ لڑکے نے پوچھا۔

”جی نہیں، داخلہ لینا چاہتا ہوں۔“

”داخلہ۔“ لڑکے نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”مگر یہاں سیکنڈری کلاسیں تو نہیں ہوتیں۔“

”جی مجھے سیکنڈ ایریز میں ایڈمیشن لینا ہے۔“

”سیکنڈ ایریز میں۔“

”جی ہاں۔ بی اے کے سال دوئم میں۔“

”گویا آپ نے میٹرک پاس کر لیا۔“

”وہ تو تین سال پہلے ہی پاس کر لیا تھا۔“ وہ ابھی تک اپنی سادہ لوحی سے لڑکوں کا مذاق نہیں سمجھ سکا تھا۔

”اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔“ دوسرا لڑکا اپنے ساتھی سے بولا۔

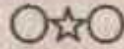
”ہمارے دانشور جو یہ کہتے ہیں کہ تعلیم کا معیار دن بدن گرتا جا رہا ہے تو کچھ غلط نہیں کہتے۔“

”مگر یار اب اتنا بھی کیا گر گیا ہوگا۔“ پہلے نے جواب دیا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ تیسرے نے پوچھا۔
”تکلیل احمد۔“

”تو تکلیل صاحب اس گیٹ سے ناک کی سیدھ میں تشریف لے جائیے۔ آگے جا کر
آپ کو ایک بلڈنگ ملے گی جس کے ایک کمرے پر آفس کی تختی لٹک رہی ہوگی۔ اگر ان
لوگوں کو آپ کی باتوں پر یقین آگیا تو داخلہ ملنے میں دشواری نہیں ہونی چاہیے۔“
تکلیل نے لڑکوں کا شکریہ ادا کیا اور گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔
”اگر اس چغد کو داخلہ مل گیا تو یہ سال بڑی دلچسپیوں سے گزرے گا۔“ پہلے لڑکے
نے شریر لہجہ میں کہا۔

”افسوس تو یہ ہے کہ وہ صرف ایک سال کے لیے آیا ہے۔ دوسرے لڑکے نے ٹھنڈی
سانس بھری۔“ اور ہماری کلاس میں بھی نہیں ہوگا۔“



قیصر اپنے دوست امجد اور مجیب کے ساتھ آئندہ ہفتے شروع ہونے والے فیسٹیول کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ اس فیسٹیول میں مختلف کھیلوں کے مقابلوں کے علاوہ دوسرے دلچسپ پروگرام بھی ہوتے تھے اور ان میں کم سے کم دو بلکہ تین آئٹم ایسے تھے جن میں قیصر کی شرکت لازمی تھی۔ اول تو وہ اپنے کالج کا مانا ہوا باکسر تھا۔ دوسرے کالج کرکٹ ایون میں بہترین فاسٹ باؤلر سمجھا جاتا تھا۔ تیسرے بزم خود پیدا کنی ہیرو تھا اس لیے ڈرامے میں حصہ لینا بھی از بس ضروری تھا۔

اس نے دور سے کھیل کو آتے دیکھا اور اپنی بات کتے کتے رک گیا۔

”کیا بات ہے۔“ امجد نے پوچھا۔

”ذرا دیکھنا کیا لا جواب کارٹون چلا آ رہا ہے۔“ قیصر نے کھیل کی طرف اشارہ کیا۔

”واقعی۔“ امجد اچھل پڑا۔ ”پہلی پھڑک اٹھی ہے نگہ انتخاب کی۔ مگر یہ تو فرسٹ ایئر

فول معلوم ہوتا ہے ہماری قسمت میں کہاں۔“

”مجھے تو اس میں بھی شبہ ہے کہ یہ ایڈمیشن کے لیے آیا ہو۔“ مجیب بھی بولا۔ ”ذرا آؤ

تو سہی۔“ قیصر پارک کی بج سے اٹھ گیا۔

کھیل کالج کے پارک کے قریب سے گزر کر آفس بلڈنگ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ تینوں

نے اس کا راستہ روک لیا۔

”آپ کسی کو تلاش کر رہے ہیں شاید۔“ قیصر نے کہا۔ ”ہم کچھ آپ کی مدد کر سکتے

ہیں؟“

”جی۔ جی ہاں۔ میں کالج کا آفس دیکھ رہا تھا۔“ کھیل نے چشمہ سنبھالتے ہوئے کہا۔

”صرف دیکھنے ہی آئے ہیں۔“ امجد نے جیسے بڑی مایوسی سے پوچھا۔

”جی نہیں داخلہ بھی لینا ہے۔“

”داخلہ۔“ ایک دم خوش ہو کر امجد نے پوچھا۔

”بی۔ اے فائل میں۔“

”بی۔ اے فائل میں۔ زندہ باد۔“

”نام کیا ہے آپ کا؟“ قیصر نے پوچھا۔

”کلیل۔“

”بہت اچھا نام ہے آپ کا قیصر نے داد دی۔“

”پلیز۔ آپ ذرا راستہ چھوڑ کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔“ یہ چار پانچ لڑکیوں کا ایک

گروپ تھا۔

”ویر ساری۔“ قیصر نہ صرف خود ہٹ گیا بلکہ دونوں ہاتھوں سے امجد مجیب اور کلیل

کو بھی ایک طرف کر دیا۔ ”آپ تشریف لے جاسکتی ہیں۔“

”شکریہ۔“ لڑکی نے اٹھلا کر جواب دیا۔ اور وہ سب کی سب قہقہے کھنکاتی آگے بڑھ

گئیں۔

”کیا یہاں مخلوط تعلیم ہے۔“ کلیل نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

قیصر نے شریر نظروں سے امجد اور مجیب کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیوں کیا آپ لڑکیوں کے ساتھ پڑھنے سے

شرماتے ہیں۔“

”جی نہیں میں کوئی لڑکی نہیں ہوں کہ شرمادوں۔“ کلیل نے جیسے برا مان کر کہا۔

”مگر آج کل تو لڑکیوں نے بھی شرمانا چھوڑ دیا ہے۔“ مجیب بولا۔

”قیصر نے شریر نظروں سے امجد اور مجیب کی طرف دیکھا۔

”تو پھر آپ نے مخلوط تعلیم کے بارے میں کیوں پوچھا۔“

”بات یہ ہے کہ اب تک مجھے کبھی کسی ایسے کالج میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس

لیے تھوڑی سی جھجک ضرور ہے۔ ویسے یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ لڑکیاں اور لڑکے

ایک ہی کالج میں تعلیم حاصل کریں۔“ کلیل اب بھی ہچکچا رہا تھا۔

”آپ تعلیم کہہ رہے ہیں۔ ہمارے یہاں تو کالج کی پرنسپل بھی ایک خاتون ہیں۔“

قیصر نے امجد کو آنکھ مارتے ہوئے جواب دیا۔
 ”اچھا۔“ ٹکیل کا منہ حیرت سے کھل گیا۔
 ”جی ہاں۔“ امجد نے تائید کی۔ ”یقین کیجئے ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔“
 ”کیا خیال ہے۔“ قیصر نے مجیب کی طرف دیکھا۔ ”ٹکیل صاحب سیدھے سادے
 شریف نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکے انہیں ضرور بنانے کی کوشش کریں گے کیوں نہ
 ہم داخلہ دلوانے میں ان کی کچھ مدد کریں۔“
 ”بہت نیک خیال ہے۔“ مجیب نے فوراً تائید کی۔
 ”آئیے صاحب۔“ قیصر نے ٹکیل کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”پہلے آپ کو آفس سے داخلہ فارم
 ولادیں پھر بتائیں کہ آپ کو اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا۔“
 ”بہت بہت شکریہ۔“ ٹکیل نے بڑی ممنونیت سے کہا۔ ”میں تو سوچ رہا تھا کہ نیا کالج
 ہے پتا نہیں یہاں کے طالب علم اجنبی ساتھیوں سے کیا سلوک کرتے ہوں گے مگر آپ
 لوگ تو بڑے ہمدرد اور مخلص نظر آتے ہیں۔“
 دفتر سے فارم لیا گیا۔ وہیں دفتر کے باہر ایک بیچ پر بیٹھ کر ٹکیل نے اسے پر کیا۔
 ”اب آئیے میرے ساتھ۔“ قیصر نے کہا۔
 ”کہاں۔“ ٹکیل نے فونٹین پین بند کر کے جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”پرنسپل کے پاس۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”وہ اس وقت لائبریری میں بیٹھی ہیں جب
 تک وہ فارم پر اپنے دستخط نہ کر دیں۔ آپ فیس وغیرہ جمع نہیں کر سکتے۔“
 وہ امجد اور مجیب سے مخاطب ہوا۔
 ”تم لوگ یہیں بیٹھو میں ٹکیل صاحب کو لائبریری چھوڑ کر ابھی آتا ہوں۔“ وہ ٹکیل
 کو ساتھ لے کر چلا۔
 ”یہ داخلے کے دنوں میں پرنسپل صاحبہ اپنے آفس کے بجائے لائبریری میں کیوں
 بیٹھتی ہیں۔“ راستے میں ٹکیل نے پوچھا۔
 ”بس ان کی مرضی۔“ قیصر نے اس طرح کہا۔ جیسے ٹالنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔“ ثکیل نے قیصر کی طرف دیکھا۔
 ”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ مگر قیصر کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ ضرور کوئی ایسی بات

ہے۔

”شاید آپ بتانا نہیں چاہتے۔“
 ”دیکھیے ثکیل صاحب۔ پرنسپل صاحبہ ہم سب کے لیے محترم ہیں اور میں نہیں
 چاہتا کہ آپ میرے بارے میں یہ رائے قائم کریں کہ میں اپنے استادوں کی عزت نہیں
 کرتا۔“ قیصر بڑی عمدہ اداکاری کر رہا تھا۔

”اگر کوئی ایسی بات ہے جس کا نہ جاننا مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے اور پھر وہ حقیقت بھی
 ہے تو آپ کو چھپانا نہیں چاہیے۔ استادوں کا احترام اپنی جگہ ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو
 نہیں کہ آدمی جھوٹ بولے۔“

”بات یہ ہے کہ ثکیل صاحب۔“ قیصر نے نمایاں ہچکچاہٹ کے بعد بتایا۔ ”کہ پرنسپل
 صاحبہ نے نہ صرف مزاج کی بہت تیز اور چڑچڑی ہیں بلکہ کچھ اونچا بھی سنتی ہیں اور مصیبت
 یہ ہے کہ سماعت کمزور ہونے کے باوجود وہ نہیں چاہتیں کہ کوئی انہیں برا سمجھے چنانچہ
 مخاطب کے لیے بڑی مشکل ہوتی ہے۔ وہ آہستہ بولے تو انہیں سنائی نہیں دیتا اور زور سے
 بولے تو گھڑنے لگتی ہیں کہ کیا مجھے برا سمجھ رکھا ہے۔“

”پھر تو بڑی مشکل ہے۔“ ثکیل نے بڑی فکر مندی سے کہا۔ ”میں ان سے بات کیسے

کروں گا۔“

”اگر لائبریری میں کوئی اور بھی ہوا تو واقعی آپ کے لیے ایک پرابلم ہوگی لیکن اکیلی
 ہوں تو آپ بے شک زور سے بات کر سکتے ہیں۔ وہ بھی زیادہ برا نہیں مانیں گی۔ بس یہ خیال
 رکھیے گا کہ انہیں غصہ نہ آئے۔“

لائبریری کالج کی عمارت سے علیحدہ اور پارک کے دوسرے طرف واقع تھی۔ داخلے
 اور فیس جمع کرنے کے سلسلے میں زیادہ تر طلباء آفس کی طرف متوجہ تھے اور باقی پارک میں
 دوستوں سے خوش گہیوں میں مصروف تھے۔ صرف دو ایک لڑکے اور لڑکیاں اخبارات اور

رسائل الٹ پلٹ کر رہے تھے اور اسٹڈی روم میں تو شہناز کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا۔

قیصر نے دروازے کا پردہ ذرا سا ہٹا کر جھانکا اور اطمینان کی سانس لیتے ہوئے ٹھیکل طرف دیکھا۔

”آپ کی قسمت اچھی ہے۔“ وہ بولا۔ ”پرنسپل صاحبہ بالکل اکیلی ہیں اور کچھ موزوں بہتر نظر آ رہا ہے۔ بس اللہ کا نام لے کر چلے ہی جائیے۔ میں پارک میں آپ کا انتظار کر ہوں۔“

”آپ بھی ساتھ چلیں نا۔“ ٹھیکل کچھ نروس سا ہو رہا تھا۔ ”آپ یہاں کے پرائیوٹ طالب علم ہیں۔ میرے مقابلے میں اچھی طرح بات کر سکیں گے۔“

”ہمارے کالج میں کسی شیرنی کا مقابلہ کرنا یا پرنسپل صاحبہ کا سامنا کرنا ایک ہی بات سمجھی جاتی ہے۔ پھر بھی میں اپنی جان پر ٹھیکل کر آپ کے ساتھ جاسکتا تھا مگر خرابی یہ ہے مجھے آپ کے ساتھ دیکھ کر وہ آپ کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کریں گی۔ کی ہدایت بھی ہے کہ داخلے یا انٹرویو کے وقت صرف متعلقہ طالب علم ہی آیا کرے آپ مجھے ساتھ لے کر گئے تو داخلہ بھی گول ہو سکتا ہے۔“

”اچھا تو پھر مجھے اکیلے ہی جانا پڑے گا۔“ ٹھیکل نے سسے ہوئے لہجے میں کہا۔
”کوئی بات نہیں۔ ہمت کیجئے۔ آپ نے سنا نہیں۔ ہمت مرداں مدد خدا۔“ قیصر نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ٹھیکل نے خشک ہونٹوں کو زبان سے ترکیا۔ پتلون کو جو کچھ نیچے کھسک آئی تھی سنبھال کر اوپر کیا۔ کوٹ کا مڑا ہوا کالر اور لفکی ہوئی آستینیں درست کیں۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا اور ڈرتے ڈرتے پردہ اٹھا کر اندر قدم رکھا۔

”مے آئی کم ان سر۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”نور اہی اسے اپنی غلطی احساس ہوا۔“ ”میرا مطلب ہے مے آئی کم ان مادام۔“

شہناز نے کتاب پڑھتے پڑھتے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا ایک ہونق سے

وہ جوان کو سامنے کھڑے دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے مگر ظاہر تھا کہ وہ لاہری کے
سٹڈی روم میں بیٹھی تھی جہاں اس کی طرح ہر طالب علم کو آنے کا حق تھا۔ اس نے
جواب دینے کے بجائے منہ دوسری طرف کر کے اپنا مطالعہ جاری رکھا۔
یہ تو بہت ہی بہری معلوم ہوتی ہیں۔ ٹکیل نے اپنے دل میں سوچا۔
”کیا میں اندر آ سکتا ہوں مادام۔“ اس مرتبہ اس نے زور سے کہا۔
”مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔“ شہناز نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کو آنا ہے تو
آتے کیوں نہیں۔“

”شکریہ۔ شکریہ۔“ ٹکیل اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔
”وہاں بیٹھے جا کر۔ میرے سر پر کیوں کھڑے ہو گئے۔“ شہناز نے اسے گھور کر دیکھا۔
”جی میرا نام ٹکیل ہے۔“ ٹکیل چیختے ہوئے بولا۔
”تو میں کیا کروں اور یہ آپ اتنا چیخ کیوں رہے ہیں۔“
”میں داخلہ لینا چاہتا ہوں۔“ ٹکیل نے آواز کا ویوم کم نہیں کیا۔
”تو کیا چیخ کر بولے بغیر داخلہ نہیں مل سکتا۔“
”جی ہاں! اس کے بغیر آپ میرے آواز کیسے سن سکیں گی۔“
”میں بہری نہیں ہوں۔“ شہناز بگڑ کر بولی۔
”مجھے معلوم ہے۔“ ٹکیل نے جلدی سے کہا۔ ”صرف ذرا سا اونچا سنتی ہیں۔“
”میں کہتی ہوں آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“
”خدا کے لیے آپ ناراض نہ ہوں۔“ ٹکیل نے گھبرا کر کہا۔ ”آپ کو غصہ آ گیا تو
آپ داخلہ فارم پر دستخط نہیں کریں گی اور دستخط نہیں ہوئے تو مجھے ایڈمیشن نہیں ملے
گا۔“

”داخلہ فارم ایڈمیشن۔“ شہناز چونکی۔ ”آخر آپ کتنا کیا چاہتے ہیں۔“
پلیز پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ غصے میں تو نہیں ہیں۔“ ٹکیل بڑی لجاجت سے بولا۔
”سٹ اپ۔“ شہناز کو جیج غصہ آ گیا۔ ”آپ سیدھی طرح بتاتے ہیں یا کان پکڑ کر

آپ کو باہر نکال دوں۔“

”خدا کے لیے آپ بگڑیں نہیں۔ میں تو صرف آپ کے کالج میں داخلہ لینا چاہتا ہوں۔“

”تو آفس جائیے۔ یہاں کیوں آئے ہیں۔“

”جی! آفس بھی گیا تھا۔ وہاں سے یہ فارم ملا ہے۔ میں نے اسے بھر دیا ہے۔ اب آپ کے دستخطوں کی ضرورت ہے۔“

”میرے دستخط۔“

”جی ہاں! اس کے بغیر ایڈمیشن نہیں ملے گا۔“

”کیوں؟“

”آپ کالج کی پرنسپل جو ہیں۔“ ٹھیکل نے جواب دیا۔

شہناز کالج کی ان لڑکیوں میں سے تھی جو ہیرو ٹائپ نوجوانوں کی توجہ کا مرکز ہوا کرتی تھیں جن کا ادنیٰ التفات حاصل کرنے کے لیے سر پھرے طالب علم طرح طرح کی حماقتیں کرتے رہتے تھے۔ اسے شبہ ہوا کہ یہ بھی اس کے ساتھ کوئی شرارت کی جارہی ہے۔ مگر شہناز بڑی رکھ رکھاؤ والی لڑکی تھی، اس نے کبھی کسی کو گستاخ ہونے کا موقع دینا تو درکنار ذرا سی بے تکلفی بھی برداشت نہیں کی تھی۔

”تو میں کالج کی پرنسپل ہوں اور آپ مجھ سے داخلہ فارم پر دستخط کرانے آئے ہیں۔“ وہ کتاب میز پر رکھتی ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”جی ہاں۔ جی ہاں۔“

ٹھیکل بوکھلا گیا۔

”دیکھیے مسٹر۔ اپنی یہ اداکاری کسی اسٹیج پر جا کر دکھائیے میں ان حرکتوں کو خاموشی سے برداشت کرنے کی عادی نہیں ہوں۔ میں نے آج سے پہلے آپ کو یہاں نہیں دیکھا اس لیے میرا خیال ہے کہ شاید اس شرارت کے لیے آپ کو آلہ کار بنایا گیا ہے۔ اٹھ قدموں واپس لوٹ جائیے اور آئندہ کے لیے یاد رکھیے کہ میں شکایت کرنے سے پہلے سر

”گنجا کر دیتی ہوں۔“

”مگر۔۔۔ یہ فارم۔۔۔“

”گیٹ آؤٹ۔“ شہناز حلق پھاڑ کر چیخی اور پیر سے سینڈل اتارنے کے لیے جھکی۔

”باپ رہے۔“ کھلیل گھبرا کر دروازے کی طرف پلٹا۔ ”پر نپل صاحبہ تو سچ بچ کھانے

کو دوڑتی ہیں۔“

شہناز سینڈل اتار کر لمبی مگر کھلیل اس سے پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔



ٹکیل بے تحاشا بھاگتا ہوا لائبریری سے نکلا۔
 ”کیوں؟ خیریت ہے۔“ قیصر نے بڑی مشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”معلوم ہوتا ہے، پرنسپل صاحبہ نے دستخط کر دیے ہیں۔“ امجد نے خیال ظاہر کیا۔ وہ
 اور مجیب بھی پارک میں آگئے تھے۔
 ”دستخط۔“ ٹکیل نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی ہاں! میں بھاگ نہ آیا ہوتا تو
 انہوں نے اپنے سینڈل سے میرے سرمبارک پر دستخط کر ہی دیے ہوتے۔“
 امجد نے ایک قہقہہ لگایا۔
 ”آپ ہنس رہے ہیں۔“ ٹکیل نے منہ بگاڑا۔ ”مجھے یہ آپ ہی لوگوں کی شرارت
 معلوم ہوتی ہے۔“
 ”چپ رہو جی۔“ قیصر نے امجد کو ڈانٹا اور بڑی ہمدردی سے ٹکیل سے پوچھا۔ ”مگر
 بات کیا ہوئی۔ کچھ بتائیے تو سہی۔“
 ”جناب انہوں نے بات کرنے کا موقع ہی کہاں دیا۔ میں فارم دکھاتا رہ گیا کہ وہ بھری
 ہوئی شیرینی کی طرح دھاڑیں۔“
 ”گیٹ آؤٹ۔“
 اگر ایک لمحے اور رک جاتا تو آج زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی امی کے علاوہ ایک عورت
 سے مار کھانا پڑتی۔ لعنت ہے ایسے کالج پر میں تو اب یہاں ایڈمیشن بھی نہیں لوں گا۔“
 ”بھیا، ہم نے تو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔“ مجیب بولا۔
 ”تو کیا سچ ایڈمیشن لینے کا ارادہ ترک کر دیا۔“ قیصر نے پوچھا۔
 ”جب فارم پر دستخط ہی نہیں ہوئے تو داخلہ کیسے ملے گا۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔ اس
 کے علاوہ یہ صاحبہ اگر کالج کی پرنسپل ہیں تو ہر لمحہ جو تم پینزاری کا اندیشہ ہے اور مجھے
 عورتوں کی جوتیاں کھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”یہ تو بزدلی ہوئی کھیل صاحب۔“ امجد نے کہا۔
 ”آپ کی جگہ اگر میں ہوتا تو اسی کالج میں ایڈمیشن لیتا اور پرنسپل صاحبہ کو دکھا دیتا کہ
 مرد ایسے ہوتے ہیں۔“ مجیب نے فوراً تائید کی۔

”یہ بات تو ہے۔“ قیصر نے بھی گردن ہلائی۔ مگر میرا خیال ہے کہ کھیل صاحب یہ
 جوش میں کہہ گئے ہیں۔ میں نے علم قیافہ پر باقاعدہ ریسرچ کی ہے اور میں دعوے سے کہہ
 سکتا ہوں کہ جو خوبصورت بلند وبالا پیشانی کھیل صاحب نے پائی ہے وہ کسی بزدل کے حصے
 میں نہیں آتی۔ میں کھیل صاحب پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ ان مستقل مزاج
 انسانوں میں سے ہیں جو ایک مرتبہ دل میں ٹھان لیں تو خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر پیچھے
 قدم ہٹانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔“

”مگر سوال تو یہ ہے کہ میرے ارادے سے بھی کیا ہوگا۔ فارم پر دستخط ہی کہاں ہوئے
 ہیں۔“ کھیل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”ارے چھوڑیے۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”کیا اتنی ذرا سی بات پر ایک جوان مرد
 انسان کو کالج میں ایڈمیشن نہیں مل سکے گا آپ ہاں تو کیجئے پھر دیکھتا ہوں کون آپ کو داخل
 ہونے سے روک سکتا ہے۔“

”یہ بات ہے تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔“ کھیل نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔
 ”کھیل صاحب زندہ باد۔“ امجد نے نعرہ لگایا۔ ”واقعی ہم تو قیصر صاحب کی قیافہ شناسی
 کی داد دیں گے۔ کیا جو کر قابل تلاش کیا ہے۔“
 ”جی۔“ کھیل چونکا۔

”جی ہاں میں اسے ماڈرن کالج کی خوش قسمتی خیال کرتا ہوں کہ آپ جیسے جو ہر قابل
 نے یہاں ایڈمیشن لینے کا ارادہ کیا ہے۔“ امجد نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

”اوہ۔ تو آپ نے جو ہر قابل کہا تھا میں کچھ اور سمجھا تھا۔ کھیل نے سادگی سے کہا۔
 مجیب اور امجد کو ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گئی۔

”اچھا یہ باتیں تو پھر بھی ہوتی رہیں گی۔“ قیصر بولا۔ لائیے آپ فارم مجھے دیجئے اور

ایڈیشن فیس وغیرہ نکالے۔“

”کتنی فیس ہوتی ہے۔“ نے پوچھا۔

”آپ ڈیڑھ سو روپے دے دیں۔ کم ہوں گے تو میں اپنے پاس سے ملا دوں گا۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”حساب کتاب بعد کو ہوتا رہے گا۔“

”حساب کتاب کیا قیصر صاحب۔“ مجیب نے کہا۔ ”اب ٹھیکل صاحب ہمارے بہترین دوست بن چکے ہیں اور دوستوں کا حساب دل میں ہوتا ہے کیوں ٹھیکل صاحب۔“

”بالکل بالکل ٹھیکل نے جیب سے بٹوانا نکالتے ہوئے کہا۔ ”ڈیڑھ سو روپے بتایا ہے نا آپ نے۔“

”جی ہاں۔“

”یہ لیجئے۔“ ٹھیکل نے روپے گن کر قیصر کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ”اور یہ رہا فارم۔“

”اب آپ یہاں اطمینان سے پارک کی ٹھنڈی ہوا کھائیں بلکہ جی چاہے تو بے شک گھاس پر لوٹ لگائیے ہم ابھی فارم اور فیس دفتر میں جمع کر کے آتے ہیں۔“

”کتنی دیر لگے گی۔“ ٹھیکل نے پوچھا۔

”بس گئے اور گئے۔۔۔ میرا مطلب ہے گئے اور آئے۔“ امجد نے جواب دیا اور چٹکی بجا کر بولا۔

”یوں۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں تو کیا حرج ہے۔“

”ارے آپ کو پتا نہیں کہ پرنسپل صاحبہ کے دستخط نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں کیا چکر چلانا پڑے گا۔“ قیصر نے جلدی سے کہا۔ ”کیشیر صاحب نے آپ کی صورت دیکھ لی تو میرے سارے کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔“

”جلدی کرو۔ بھائی قیصر۔“ امجد نے اپنی رسٹ واپچ پر نگاہ ڈالی۔ ”پونے گیارہ بج رہے ہیں۔ کیشیر صاحب گیارہ بجے کھڑکی بند کر دیتے ہیں۔“

”اچھی بات ہے جائیے مگر ذرا جلدی واپس آئیے گا۔“ ٹھیکل نے بادل خواستہ کہا۔

”میں اس بیچ پر آپ کا انتظار کروں گا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے بیچ کی طرف قدم بڑھایا مگر راستے میں کوئی پتھر پڑا ہوا تھا اسے اچانک ٹھوکر سی گئی۔ قیصر اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ ٹکیل نے جلدی سے اس کے بازو کا سہارا نہ لے لیا ہوتا تو گر ہی پڑتا۔ بات اچانک ہوئی تھی، قیصر بھی اس کے لیے تیار نہیں تھا مگر اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو اور ساتھ ہی ٹکیل کو بھی سنبھال لیا۔

”بسم اللہ..... بسم اللہ..... سنبھل کر۔“ امجد نے جلدی سے ٹکیل کو پکڑا۔ ”میرے خیال سے آپ یہیں گھاس پر آرام کریں۔“

”میں شرمندہ ہوں قیصر صاحب۔“ ٹکیل نے کہا۔ ”پتا نہیں کیسے ٹھوکر لگ گئی، میں تو بہت سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں ٹکیل صاحب کبھی کبھی سنبھل کر چلنے والے بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔“ قیصر نے جواب دیا۔ اور امجد کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اؤ بھائی چلیں۔“

ٹکیل کو وہیں گھاس پر بیٹھا چھوڑ کر قیصر امجد اور مجیب آفس کی طرف چل دیے پھر جیسے ہی وہ پارک سے باہر نکلے۔ امجد قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

”واقعی قیصر بھائی جواب نہیں تمہارا۔ کیا صبح ہی صبح مرغان فوج کیا ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”یار ایسا پیدائشی چغند تو آج تک دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔“ مجیب نے کہا۔ ”یعنی وہ شہناز تک ہو آیا اور اسے پتا نہیں چل سکا کہ ہم نے اسے احمق بتایا ہے۔“

”مجھے فکر ہے کہ کہیں اس نے شہناز کو بتا نہ دیا ہو۔“ قیصر نے کہا۔ ”وہ ویسے ہی سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ ذرا سوچ کر بتاؤ کہ جب میں اسے شہناز کے پاس لے کر گیا ہوں تو اسے ہم میں سے کسی کا نام تو نہیں معلوم تھا۔“

”نام تو اسے اب بھی صرف تمہارا ہی معلوم ہوا ہے۔“ مجیب نے جواب دیا اور وہ بھی ہمارے امجد صاحب کی مہمانی سے۔“

”کیا بات کرتے ہو۔ اگر اسے شکایت ہی کرنی ہوگی تو صورت سے نہیں پہچان سکتا۔“ امجد تیزی سے بولا۔

”افوہ تم سمجھتے نہیں، بگڑنے لگتے ہو۔“ قیصر نے کہا۔ ”پر نپل صاحب کے پاس

شکایت جائے تو اسے خواہ سب کا نام معلوم ہو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب ہم تینوں ایک دوسرے کے حق میں گواہی دیں گے تو چاہے وہ دل میں قائل نہ ہوں مگر ہمیں بغیر ثبوت کے سزا نہیں دے سکتے۔ جب کہ شہناز پہلے ہی مجھ سے بدگمان ہے۔ اسے تو کوئی جھوٹ موٹ بھی جا کر کہہ دے کہ میں نے یہ کیا ہے تو فوراً یقین کر لے گی۔“

”یہ بات تھی تو تمہیں اس بے وال کے بودم کو شہناز کے پاس بھیجنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ امجد نے جواب دیا۔

”شرارتیں سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتیں۔“ مجیب بولا۔ ”یہ تو خیال آیا اور عمل کر بیٹھنے والی بات ہے۔ اس کے علاوہ شہناز قیصر کی خالہ زاد بہن ہے۔ بات بڑھتی بھی تو حد کے اندر رہتی۔ اس کے بجائے کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو اس کے سینڈل مسٹر شکیل کے ساتھ ساتھ ہمارے سروں پر بھی برس سکتے ہیں۔“

”اچھا خیر جو ہو گا بھگت لیں گے۔“ امجد نے رکتے ہوئے کہا۔ ”بہت دیر نکل آئے۔ اب مال غنیمت نکالو اور یاروں میں تقسیم کر دو۔ ابا جان سے کئی طرح کے بہانے بنائے مگر انہوں نے مقررہ فیس کے علاوہ ایک پیسا زیادہ نہیں دیا۔ میں صبح سے اسی فکر میں تھا کہ اس مہینے کا خرچ کیسے چلے گا۔“

”کیوں؟ تمہیں جیب خرچ نہیں ملتا کیا۔“ مجیب نے پوچھا۔
 ”ملتا تو ہے مگر وہ پہاڑ پر جانے کی لیے پیشگی وصول کر چکا ہوں۔“
 ”تو یوں کہو ان چھٹیوں میں خوب گھوم پھر کر آئے ہو۔“ قیصر نے شکیل کے دیئے ہوئے روپے جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

”خوب تو نہیں مگر ہاں کچھ نہ کچھ سیر تو ہو ہی گئی۔“
 ”تو بھی پچاس روپے تمہارے اور یہ پچاس تمہارے۔“ اس نے روپے گن کر دیتے ہوئے کہا۔

”امجد اور مجیب نے اپنے اپنے حصے کی رقم وصول کر کے جیب میں رکھی۔
 ”یہ پچاس بھی ہمیں ہی دے دو نا۔“ مجیب بولا۔ ”تم ٹھہرے بڑے آدمی کے بیٹے تمہیں پچاس روپے کی کیا پروا۔“

”روپے کی پروا کسے نہیں ہوتی دوست۔“ قیصر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور پھر اس رقم کی اہمیت اس کی وجہ سے تو نہیں ہے، یہ تو مارا ہوا شکار ہے۔ شکار کھانے کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔“

اس نے اپنا ہڈا نکالنے کے لیے اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ فوراً ہی اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرے اور اس نے جلدی سے ہاتھ باہر نکال کر دوسری جیب میں ٹٹولنا شروع کر دیں۔

”کیا بات ہے؟“ امجد نے پوچھا۔

”غضب ہو گیا۔“ امجد بھائی۔ ”قیصر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کسی نے ہڈا پار

کر دیا۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ امجد نے تیزی سے کہا۔ ”استادوں پر کوئی ہاتھ صاف کر سکتا ہے۔ ضرور تم کہیں رکھ کر بھول گئے ہو یا کہیں گر گیا ہو گا۔“

”بھولنے یا گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ قیصر نے جیبوں کو دوبارہ ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے سامنے ہی تو پان والے کی دکان پر سگریٹ لیے تھے اور بڑے میں سے پانچ کانوٹ نکال کر دیا تھا۔“

”پھر وہیں تو نہیں چھوڑ آئے۔“ امجد نے پوچھا۔

”نہیں وہاں تو میرے سامنے قیصر بھائی نے باقی ریزگاری لے کر ہڈا جیب میں رکھ لیا

تھا۔“ عجیب بولا۔

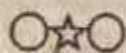
”پھر کہاں جاسکتا ہے۔“ امجد سوچ رہا تھا۔

”رقم کتنی تھی؟“ مجید نے پوچھا۔

”ڈیڑی سے تین سو روپے لایا تھا۔“ قیصر نے یوں کہا جیسے بس اب رونے ہی والا

ہے۔ ”اور ابھی فیس بھی جمع نہیں کرائی تھی۔“

”پھر تو یہ پچاس روپے تمہیں بڑے منگے پڑے بھیا۔“ امجد منہ بسور کر بولا۔



تھکیل بڑی دیر تک پارک میں قیصر اور اس کے دوستوں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا مگر جب گیارہ سوا گیارہ اور پھر ساڑھے گیارہ بج گئے اور وہ لوگ واپس نہیں آئے تو تھکیل خود ہی اٹھ کر آفس کی جانب چلا لڑکے اب بھی فیس جمع کر رہے تھے۔ مگر ہجوم بڑی حد تک کم ہو گیا تھا وہ پوچھتا پوچھتا اس کاؤنٹر پر پہنچا جہاں نئے داخلے کی فیس وصول کی جا رہی تھی۔
”معاف فرمائیے۔“ وہ کلرک سے مخاطب ہوا۔ کلرک نے چونک کر دیکھا ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔

”یہ الفاظ تو مجھے کہنا چاہیے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بہر حال پہلے اپنا قصور بھی تو بتائیے۔ معاف کرنے کا سوال تو اس کے بعد ہی زیر غور لایا جاسکتا ہے۔“
”جی۔ میرا قصور؟“ تھکیل نے گھبرا کر پوچھا۔
”آپ نے کہا نا کہ معاف فرمائیے تو آدمی کسی غلطی پر ہی تو معافی مانگتا ہے۔“
”اوہ! وہ تو میں آپ سے مخاطب ہوا تھا۔“
”کس سلسلے میں؟“

”دیکھیے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ قیصر صاحب نے میری داخلہ فیس جمع کرادی ہے یا نہیں۔“ تھکیل نے پوچھا۔
”کون قیصر صاحب۔“ کلرک نے سوال کیا۔ ”کس کلاس میں پڑھتے ہیں۔“
”جی یہ تو پتا نہیں۔“ تھکیل نے سر کھجایا۔ ”ہمیں کالج میں ملاقات ہوئی تھی جب انہیں معلوم ہوا کہ میں ایڈمیشن لینا چاہتا ہوں تو انہوں نے پہلے فارم بھروایا پھر پرنسپل صاحبہ کے پاس لے کر گئے۔“

”جی۔۔۔“ کلرک چونکا۔ ”پرنسپل صاحبہ۔“
”جی ہاں۔ وہ اس وقت لائبریری میں بیٹھی ہوئی تھیں۔“ تھکیل نے کلرک کے رد عمل پر غور کیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ”مگر انہوں نے فارم پر دستخط کرنے سے انکار

کر دیا۔ میں نے قیصر صاحب کو بتایا تو انہوں نے بڑی ہمدردی ظاہر کی اور اطمینان دلایا کہ وہ پرنسپل صاحبہ کے دستخطوں کے بغیر داخلہ کرا دیں گے چنانچہ میں نے ڈیڑھ سو روپے فیس مع فارم کے انہیں دے دی تھی۔ آپ ذرا اپنا رجسٹر دیکھ لیں اس بات کو نصف گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اب تک تو یقیناً جمع کرا دینا چاہیے تھی۔“

”مولانا۔ کوئی شبہ نہیں آپ کی صورت ہی کچھ ایسی ہے۔“ کلرک نے غور سے کلیل کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ کلیل نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ ”میں نے آپ سے اپنی شکل و صورت پر تبصرہ کرنے کو تو نہیں کہا تھا۔“

”محترم کیا آپ اب بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کسی نے آپ کو فرسٹ ایر فول بتایا ہے۔“ کلرک نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

”مگر میں تو بی اے فائنل میں داخلہ لینا چاہتا ہوں۔“

”کیا۔“ اب کلرک کچھ حیران نظر آ رہا تھا۔ ”پھر تو واقعی آپ کا جواب نہیں۔“

”یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ بغیر اپنا رجسٹر چیک کیے آپ کیسے بتا سکتے ہیں کہ میرے نام سے فیس جمع کرائی گئی ہے یا نہیں۔“ کلیل نے کہا۔

”دیکھیے جناب پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے کالج میں کوئی پرنسپل صاحبہ نہیں بلکہ پرنسپل صاحب ہیں۔“

”مگر۔۔۔ مگر میں خود ان سے مل کر آیا ہوں۔“ کلیل حیران بھی تھا اور کچھ پریشان بھی۔

”یہ بات ہے تو دیکھیے وہ سامنے صدر مملکت تشریف رکھتے ہیں۔ کلرک نے چہرہ اسی کی طرف اشارہ کیا جو اسٹول پر آفس کے دروازے کے قریب بیٹھا تھا۔ ”ان سے جا کر بات کیجئے۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“ کلیل نے کہا۔ ”یہ تو چہرہ اسی ہے شاید۔“

”سبحان اللہ۔“ کلرک نے جواب دیا۔ ”اسی شاید کا جواب نہیں۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ اسی طرح قیصر صاحب نے خواہ مخواہ کسی خاتون کے بارے میں کہہ دیا تھا حالانکہ وہ پرنسپل نہیں تھیں۔“
”بہت دیر میں سمجھے۔“

”مگر۔۔۔ پھر وہ۔۔۔ میرے ڈیڑھ سو روپے۔“ کلکیل نے گھبرا کر پوچھا۔
”ان پر آپ فاتحہ پڑھ لیجئے۔“ کلرک نے بڑے مزے سے جواب دیا۔
”آپ رجسٹر تو دیکھ لیں۔“ کلکیل نے خوشامدی کی۔ شاید قیصر صاحب نے فیس جمع کرا دی ہو۔“

”آپ کی تسلی کے لیے میں دیکھے لیتا ہوں مگر مجھے یقین نہیں کہ ایسا ہوا ہوگا۔ کلرک نے رجسٹر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔“ آپ کا نام کیا ہے؟“
”کلکیل احمد۔“

”اور آپ نے بی اے فائنل میں داخلہ لینے کے لیے فارم بھرا تھا۔“
”جی ہاں۔“

کلرک نے رجسٹر کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیے۔ کلکیل بڑی امید و بیم کی حالت میں اسے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں بھائی صاحب۔“ کلرک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس نام سے بی اے فائنل میں کسی کی فیس داخلہ جمع نہیں کرائی گئی ہے۔“

”اوہ خدا!“ کلکیل بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اب میں کیا کروں! میرے پاس تو یہی روپے تھے جو بڑی مشکل سے میں نے کالج میں داخلہ لینے کے لیے قرض لیے تھے۔“ بھائی صاحب آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ قیصر صاحب اور ان کے دوست کون سی کلاس میں پڑھتے ہیں۔“

”مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ مگر مجھے امید نہیں کہ انہوں نے آپ کو اپنا نام بھی صحیح بتایا ہوگا۔“ کلرک نے جواب دیا۔ ”اب آپ ایسا کریں کہ سیدھے پرنسپل صاحب کے پاس چلے جائیں۔ ان کا کمرہ اسی برآمدے کے بالکل آخر میں ہے۔ اگر وہ لڑکے اسی کالج

کے ہوں گے تو شاید آپ کی رقم واپس مل جائے۔“

تھکیل آگئیں آنکھوں کے ساتھ دفتر سے باہر نکل آیا مگر اس کے قدم پر نیپل صاحب کے کمرے کے بجائے پارک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پارک میں داخل ہو کر اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے جو گوشہ منتخب کیا وہ لائبریری کی پشت پر واقع تھا اور وہ بیچ جس پر اس نے بیٹھتے ہی سسکیاں لینی شروع کر دیں تھیں عین اسٹڈی روم کی کھڑکی کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ وہی اسٹڈی روم جس میں شہناز بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

پہلے تو اس نے کوئی خیال نہیں کیا مگر جب ہوا کے ہر تازہ جھونکے کے ساتھ سسکیوں کی آواز کی شدت بڑھتی ہی گئی تو اسے اٹھنا پڑا۔ وہ کھڑکی کے پاس آئی جھانک کر دیکھا اور اس ڈھیلے ڈھالے براؤن رنگ کے کوٹ پتلون پر نظر ڈالتے ہی سمجھ گئی کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ پہلا خیال اس کے دل میں ہی آیا کہ اب شاید یہ کوئی نیا سوانح بھرا جا رہا ہے مگر کوئی اس بری طرح بناوٹی طور پر رو بھی سکتا ہے اس کا یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

پھر اس نے سوچا کہ اس نے تھکیل کو ڈانٹ دیا تھا کہیں یہ اس کا رد عمل تو نہیں۔ وہ اپنی شکل و صورت اور وضع قطع سے بہت سیدھا سادا نوجوان نظر آ رہا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ کچھ شریر طالب علموں نے اسے ہکا کر اس کے پاس بھیج دیا ہو۔ شہناز جیسے جیسے غور کرتی گئی اسے یقین ہوتا گیا کہ ضرور یہی بات ہوگی ورنہ تھکیل ایسا لڑکا نظر نہیں آتا تھا جو کسی لڑکی کو چھیڑنے یا اس کے ساتھ شرارت کرنے کی کوشش کر سکے۔ یہ سوچ کر اسے انفس ہونے لگا کہ سوچے سمجھے بغیر اس نے ناحق ہی غریب کو ڈانٹ دیا۔

شہناز نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بجنے والے تھے گھر جانے کا وقت بھی ہو چلا تھا۔ اس نے کتاب لائبریری کو واپس کی اور باہر نکل آئی۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ اسی طرف بڑھ رہے تھے جہاں تھکیل بیچ پر بازوؤں میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہا تھا۔ شہناز قریب جا کر کھڑی ہو گئی اور کئی لمحوں تک اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔

”تھکیل صاحب۔“ آخر اس نے آہستہ سے پکارا۔

تھکیل نے چونک کر ایک دم اس کی طرف دیکھا۔ شہناز ایک لمحہ کے لیے اس کی بڑی

بڑی سرخ بہتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مبہوت سی رہ گئی۔ اس وقت وہ مونہ بھدا بد نما چشمہ اس کی آنکھوں پر موجود نہیں تھا۔ اور چشمہ کے بغیر یہ روتا ہوا ٹھیکل شہناز کو بڑا اچھا معلوم ہوا۔

”آپ۔“ ٹھیکل نے جلدی سے جیب سے رومال نکال کر آنسو خشک کیے اور چشمہ کے شیشے صاف کر کے دوبارہ لگاتے ہوئے زبردستی مسکرائے کی کوشش کی۔
 ”مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ پرنسپل صاحبہ نہیں ہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں اس گستاخی کے لیے معذرت خواہ ہوں مگر میں نہیں جانتا تھا کہ میں ایک سنگین شرارت کا نشانہ بنایا جا رہا ہوں۔“

”آپ رو کیوں رہے تھے۔“ شہناز نے پوچھا۔
 ”کون میں نہیں تو۔“ ٹھیکل کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی ہنسی ابھر آئی۔
 ”دیکھیے۔“ شہناز سر جھکا کر بولی۔ ”میں نے شاید انجانے میں آپ کو کچھ زیادہ سخت الفاظ کہہ دیے تھے۔“
 ”ارے نہیں۔“ ٹھیکل نے جلدی سے کہا۔ ”میں کوئی ان کی وجہ سے تھوڑی رو رہا تھا۔“

”پھر کیا بات تھی۔“ شہناز آہستہ سے مسکرائی۔ ٹھیکل نے کتنی سادگی سے اپنے رونے کا اعتراف کر لیا تھا۔
 ”دیکھیے۔۔۔ بات یہ تھی۔۔۔ ٹھیکل نے رک رک کر شہناز کو پوری داستان کہہ سنائی۔
 ”قیصر۔“ شہناز نے زیر لب کہا۔ اس کی آنکھوں میں دبا ہوا غصہ صاف دیکھا جاسکتا تھا۔

”آپ جانتی ہیں ان لوگوں۔“ ٹھیکل نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔
 ”ایک قیصر صاحب سے واقف ہوں۔“ شہناز نے جواب دیا۔ ”اگر یہ وہی حضرت ہیں جنہوں نے آپ کو پریشان کیا ہے تو اطمینان رکھیے آپ کے روپے ضرور مل جائیں

”

اس نے اپنا پرس کھولا۔

”مگر پہلے آپ کا ایڈمیشن ہو جانا چاہیے۔ یہ لیجے ڈیڑھ سو روپے، دو سرافارم بھر دیجئے اور فیس بھی جمع کرا دیجئے۔“

”کلیل نے روپے لینے میں ہچکچاہٹ ظاہر کی۔

”لے لیجئے۔“ شہناز نے پھر کہا۔

”مگر میں ایک خاتون سے مالی امداد نہیں لے سکتا۔“ کلیل نے جواب دیا۔

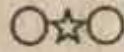
”کیوں کیا خواتین کو کسی کے ساتھ سلوک کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔“ شہناز مسکرائی۔

”پتا نہیں۔ مگر میری امی کہتی ہیں کہ عورتوں کو تعلیم دلانا تو خیر اچھی بات ہے مگر انہیں

یہ احساس نہیں دنا چاہیے کہ وہ مردوں کی مالی اعانت بھی کر سکتی ہیں۔ یہیں سے وہ چور و روازہ کھل جاتا ہے بالآخر عورت کو گھر سے نکال کر بازار میں لے آتا ہے۔“

”اعانت نہ سہی غصہ نہ سمجھ کر لے لیں۔“ شہناز نے سنجیدگی سے کہا اور تقریباً

زبردستی کلیل کے ہاتھ میں نوٹ دے کر وہ جلدی سے پارک سے باہر نکل گئی۔



ٹھیک کو آخر کار ماڈرن کالج میں داخلہ مل ہی گیا۔ ایڈمیشن کی گمانگہی ختم ہوئی
کلاسیں بھی کچھ باقاعدہ ہونے لگیں مگر ابھی پڑھائی شروع نہیں ہوئی تھی جس کی بڑی
یہ ہی تھی کہ چند دن بعد ہی کالج کا سالانہ فیسٹول ویک شروع ہو رہا تھا اور طلباء کے
پروفیسر صاحبان بھی اس کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔

قیصر کو ٹھیک کے داخلے کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا اور شاید اسی لیے وہ
مضامین کی کلاسوں سے غیر حاضر رہتا تھا۔ جہاں ٹھیک سے سامنا ہونے کا امکان تھا۔
نے اسے ایک دن آڑے ہاتھوں لینے کی کوشش کی تھی مگر اس نے بڑی دھڑائی سے صاف
انکار کر دیا۔

شہناز بظاہر خاموش ہو گئی مگر قیصر کے لیے جو نفرت اس کے دل میں پہلے سے
تھی اس واقعہ کے بعد سے کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔

وہ خود بھی آرٹس پڑھ رہی تھی۔ اردو اور معاشیات کے دو مضامین ایسے تھے جو قیصر
اور ٹھیک کے پاس بھی تھے اور وہ شکر ادا کر رہی تھی کہ فی الحال قیصر ان مضامین کی کلاسوں
سے غائب ہے۔ اگرچہ اس کی وجہ شہناز کے نزدیک وہ نہیں تھی جو حقیقتاً تھی بلکہ وہ اس
ذمے دار فیسٹول ویک کو ٹھہرا رہی تھی۔ ٹھیک کے ساتھ اس کا برتاؤ وہی تھا جو دوسرے
لڑکوں کے ساتھ تھا۔ گاہے گاہے آمناسامنا ہونے پر دعا سلام اور خیر و عافیت کے چند
جملے اور بس۔ البتہ جب کالج کے دوسرے شریر لڑکے اس کا مذاق اڑاتے، اسے ستاتے
پریشان کرتے تو نہ معلوم کیوں شہناز کو اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔

اردو کا پیریڈ تھا۔ لڑکے کلاس میں حسب عادت شور مچا رہے تھے۔ باتیں ہو رہی
تھیں۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ لڑکیوں کا عام معمول تھا کہ وہ اس وقت کلاس میں آتیں جب
پروفیسر صاحب آجاتے۔ ٹھیک نے بھی اس طریقے کو اپنایا ہوا تھا۔ چنانچہ نہ وہ اس وقت
کلاس میں موجود تھا اور نہ لڑکیاں لیکن آج اتفاق سے قیصر حاضر تھا۔

”ارے بھئی کوئی بتائے کہ آج ہمارے مسٹر مولانا بھی آئے ہیں یا نہیں۔“
 ”یہ کون گستاخ ہے جسے یہ تک معلوم نہیں کہ سورج مغرب کے بجائے مشرق سے
 نکل سکتا ہے مگر مولانا کو کالج میں طلوع ہونے سے باز نہیں رکھا جاسکتا۔“ دوسرے نے
 جواب دیا۔

”ویسے بائی دی وے آپ بتا سکتے ہیں کہ سورج آج کل کہاں سے نکل رہا ہے۔“ ایک
 گروٹے سے آواز آئی۔

”پتا نہیں بھیا بچپن میں دادی اماں سے سنا تھا کہ مشرق سے نکلتا ہے مگر یہ کوئی دس
 پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ اب سورج اتنا بھی کیا وضع دار ہو گا کہ ہم لوگ کعبے سے
 واشنگٹن اور ماسکو جا پہنچیں اور وہ مشرق سے مغرب تک بھی نہ آسکے۔“

”اوں۔ ہوں۔ اندازہ نہیں چلے گا۔ ہمیں عینی شہادت چاہیے۔“ اسی آواز نے
 جواب دیا۔ ”کیا کوئی کامریڈ حلفیہ بیان کر سکتے ہیں کہ سورج آج کل مشرق سے طلوع ہو رہا
 ہے یا مغرب سے۔“

”جناب پریکٹیکل مشکلات کی بنا پر عینی شہادت ملنا تو ناممکن ہے۔“ پہلے نے کہا۔ ”مگر
 سنا ہے کہ وہ نالائق ایسے وقت نکلتا ہے جب کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لیے بعض
 حلقوں کی جانب سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ آئندہ سورج کو بارہ بجے نہیں تو دس گیارہ بجے
 طلوع ہونا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے اگر مسٹر مولانا کو اس مسئلہ پر اظہار خیال کی دعوت دی جائے تو وہ
 ضرور کوئی تاریکی ڈال سکیں گے۔“ کسی نے مشورہ دیا۔

”تاریکی ڈال سکیں گے سے آپ کی مراد غالباً روشنی سے ہے۔“
 ”جی نہیں۔ ذرا سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ سورج بذات خود روشن ہے۔ اس پر کوئی
 روشنی کیسے ڈال سکتا ہے۔“

”بہت خوب۔ تو مولانا کی خدمت میں کوئی وفد بھیجا جائے۔“

”سوال یہ ہے کہ وہ آج بھی جائیں گے۔“

”اگر آپ لوگ صرف پانچ منٹ کے لیے خاموشی اختیار کر لیں۔“ ایک صاحبزادہ اٹھتے ہوئے بولے۔ ”تو میں انہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ پروفیسر صاحب کلاس میں آئیں گے اور اب ان کی عزت و آبرو کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔“

”ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔ سائنٹ پلینز۔“

کلاس میں قدرے سکون ہوا تو وہی صاحب زادے اٹھ کر باہر گئے اور نہ جانے کیا پڑھائی کہ کھیل ان کے ساتھ آنے پر تیار ہو گیا۔ قیصر اور امجد اس کارروائی سے بالکل الگ تھلگ ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ امجد نے کھڑکی سے کھیل کو آتے دیکھا تو کھڑا ہو گیا۔

”یہ رشید تو سچ سچ اسے لے آیا۔“ امجد نے قیصر کے کان میں سرگوشی کی۔

”آؤ باہر چلیں۔“

”لا حول ولا قوۃ“ یار تم نے مجھے بھی بزدل بنا دیا ہے۔“ قیصر نے اٹھنے کے بجائے امجد ہاتھ پکڑ کر اسے بنا دیا۔ ”اتنے دن محض تمہارے ڈر کی وجہ سے میں کلاس میں نہیں آیا۔ تم اتنا گھبراتے کیوں ہو۔ دس مرتبہ سمجھا چکا ہوں کہ اگر ہم دونوں اپنے بیانات پر اڑے رہے تو ہمارے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اس گدھے کی اگر شکایت کرنے کی ہمت ہوتی تو اب تک کیا خاموش بیٹھا رہتا۔“

”کلاس۔“ رشید نے اندر قدم رکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ”اسٹینڈ اپ۔“

اور پوری کلاس ایک دم کھڑی ہو گئی۔ کھیل نے یہ منظر دیکھا اور اس کے قدم دروازے میں ہی رک گئے، چاہتا تھا کہ وہیں سے پلٹ جائے مگر رشید نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”سٹ ڈاؤن پلینز۔“ رشید نے کہا اور کھیل کو گھسیٹ کر اس تخت پر کھڑا کر دیا جس پر پروفیسر کی میز کرسی پڑی ہوئی تھی اور جہاں وہ کھڑے ہو کر لیکچر دیا کرتے تھے۔ لڑکے بڑی سعادت مندی سے بیٹھ گئے۔

”پیارے ساتھیو! رشید نے کہنا شروع کیا۔“ آپ لوگوں کے سامنے ہماری کلاس ہی

کی نہیں بلکہ پورے کالج کی سب سے بزرگ و محنتی ہستی کھڑی ہے۔ حاشا و کلا میرا اشارہ اپنی ذات والا تبارک کی جانب نہیں بلکہ اعلیٰ حضرت قبلہ و کعبہ جنت مکانی، خلا آشیانی تارک دنیا و جوانی، نیم مردانی و نیم زنانی مشر و مولانا کلیل احمد مدظلہ کی جانب ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر آپ مولانا موصوف سے رجوع فرمائیں گے تو جواب شافی پائیں گے۔

”مولانا۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آج کل سورج مشرق سے نکلتا ہے یا مغرب سے۔“ ایک لڑکے نے کھڑے ہو کر پوچھا۔

رشید اب تک کلیل کا بازو پکڑے ہوئے تھا۔ کلیل نے گہرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا مگر راہ فرار مسدود تھی۔ مجبوراً اس نے جیب سے رو مال نکال کر پہلے ماتھے کا پسینہ خشک کیا پھر دو تین گہری گہری سانس لیں۔

”میرا خیال ہے کہ اب آپ مجھے چھوڑ دیں تو بہتر ہے میں بھاگوں گا نہیں۔“ اس نے رشید سے کہا۔

کلاس میں ایک قہقہہ پڑا۔ کچھ تالیاں بھی بجائی گئیں۔

”کیا آپ اپنا سوال دوبارہ پوچھنے کی زحمت فرما سکتے ہیں۔“ اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

”میرا سوال تھا مولانا کہ سورج آج کل مغرب سے نکلتا ہے یا مشرق سے۔“

”بھائیو میں یہاں کے لئے ایک نیا آدمی ہوں اور بالکل نووارد۔“ کلیل نے اپنی پیشانی پر رو مال پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ کی مقامی سیاست کے بارے میں میرا علم بالکل محدود ہے۔ مگر چونکہ میں جمہوریت کا قائل ہوں اس لیے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس بارے میں جھگڑے سے کوئی فائدہ نہیں جہاں چار بھائی کہہ دیں اسی طرف سے سورج کا نکلنا تسلیم کر لیا جائے۔“

اس جواب پر بے پناہ تالیاں بجائی گئیں۔ کلیل کو موقع مل گیا اور وہ نیچے اتر کر اپنی سیٹ کی طرف چل دیا۔ قیصر اور امجد سب سے کچھلی سیٹوں پر تھے۔ اس لیے ابھی تک کلیل کی نظر ان پر نہیں پڑی تھی مگر آگے قدم بڑھاتے ہی اس نے انہیں دیکھ لیا۔

”تو آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔“ وہ لپک کر قیصر کے قریب پہنچا تھا۔
 ”آپ بھی اگر غالب پر مضمون لکھ کر نہ لائے ہوں تو یہاں تشریف رکھ سکتے ہیں۔“
 قیصر نے جواب دیا۔ ”اخلاق صاحب آخری مہینوں تک کبھی نہیں پہنچتے۔“
 ”میرے ڈیڑھ سو روپے کہاں ہیں۔“ ٹکیل نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔
 ”آپ کا کیا خیال ہے کہ میں بھی آپ کی طرح کوئی مولانا ہوں جو ہر بے تکے سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔“ قیصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں ان کا خیال ہے کہ شاید آپ بھی اس کے جواب میں یہی کہہ دیں گے کہ جہاں چار بھائی فیصلہ کر دیں۔“ امجد بھی بولا۔

”آپ مجھے باتوں میں نہیں اڑا سکتے۔“ ٹکیل نے تیزی دکھائی۔ ”میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ آپ وہی ہیں جنہوں نے فیس جمع کرانے کے بہانے مجھ سے ڈیڑھ سو روپے لیے اور ایسے غائب ہوئے کہ آج نظر آئے ہیں۔“

”کیا بات ہے بھئی۔“ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لڑکے بھی متوجہ ہو چکے تھے ٹکیل نے تمام باتیں مختصر طور پر بتا دیں۔

”مجھے نہیں معلوم کہ یہ غلط فہمی آپ کو کیوں ہوئی۔“ قیصر نے کمال رعونت سے جواب دیا۔ ”آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایسے ڈیڑھ سو روپیہ خیرات کر دیا کرتا ہوں۔ آپ کو کبھی ضرورت ہو تو بلا تکلف ہاتھ پھیلا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ میرے دوست امجد صاحب گواہ ہیں کہ میں کالج کھلنے کے دن آیا ضرور تھا مگر دس بجے ہی واپس چلا گیا تھا۔“
 ”کیا قصہ ہے دوستو۔“ کچھ اور لڑکے اپنی سیٹوں سے اٹھ کر آگئے۔

”یہ قیصر صاحب میرے ڈیڑھ سو روپے ہضم کرنا چاہتے ہیں۔“ ٹکیل نے بتایا۔ اور ایک مرتبہ پھر اسی پوری روداد دہرائی۔

”کچھ روپے کے لین دین کی بات ہو رہی ہے کیا۔“ یہ ایک نئے آنے والے تھے۔
 ”جی ہاں۔ میرے ڈیڑھ سو روپے قیصر صاحب نے فیس جمع کرانے کے بہانے ٹھک لیے ہیں۔“ ٹکیل نے جواب دیا اور پھر تمام باتیں دہرانے لگا۔

”یارو کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ کس نے کس سے کیا لیا۔“ ٹکیل قیصر اور امجد کے گرد ہجوم کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

”کچھ نہیں بھائیو۔“ ٹکیل نے ایک مہری سانس لی۔ ”میں بھی آپ کی طرح دیکھنے آیا تھا کہ قیصر صاحب کے گرد بھڑکیسی لگی ہے۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ احباب انہیں پر سادے رہے ہیں۔“

”کیوں؟ خیریت کسی کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”جی ہاں! دیانت مر گئی ہے قیصر صاحب کی۔“ ٹکیل نے جواب دیا اور اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

”اپنی سیٹ پر پہنچا تو آج شکور کے بجائے اس کے برابر رشید بیٹھا ہوا تھا۔ بیٹھنا چاہا تو کرسی بھی کچھ نئی نئی سی معلوم ہوئی۔“

”کیا دیکھ رہے ہو مولانا۔“ رشید بولا۔ ”یہ وہ تاریخی کرسی ہے جس پر کسی زمانے میں شہنشاہ تیمور لنگ نزول اجلاس فرمایا کرتے تھے۔ پھر جب سکندر یونانی نے ایران پر حملہ کیا تو دوسرے مال غنیمت کے ساتھ اسے بھی یونان لے گیا وہاں سے یہ چنگیز خان کے ہاتھ آئی۔ جب تک وہ زندہ رہا استعمال کرتا رہا مرنے لگا تو بابر کو بلا کر اس کے سپرد کر دی۔ چنانچہ یہ وہی کرسی تھی جو ہمایوں کے کتب خانے میں بچھی رہتی تھی اور بعد میں جسے دیکھ کر شاہجہاں کو تخت طاؤس بنوانے کا خیال پیدا ہوا تھا۔“

”اچھا۔“ بڑی حیرت کی سے ٹکیل نے پوچھا۔ ”پھر تو اس کرسی پر آپ کو بیٹھنا چاہیے۔“

”بھلا یہ گستاخی میں کیسے کر سکتا ہوں آپ کے ہوتے ہوئے۔“

رشید کی بات ادھوری ہی رہ گئی کیونکہ اسی وقت پروفیسر اخلاق حسین صاحب آگئے اور پوری کلاس ان کے احترام میں کھڑی ہو گئی۔

”بیٹھ جائیے۔ بیٹھ جائیے۔“ اخلاق صاحب نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

”رشید۔“

”لیس سر۔“ رشید نے جواب دیا۔

”بھئی وہ تم نے کل میرا قلم لیا تھا؟“

”لیس سر وہ میرے پاس ہے۔“

”تو اب اسے میرے پاس آنا چاہیے یا نہیں؟“

”جی ہاں! ضرور۔ ابھی لایا سر۔“ رشید جیب سے قلم نکالتے ہوئے پروفیسر صاحب کی

طرف چلا۔

اس درمیان میں ساری کلاس بیٹھ چکی تھی۔ پروفیسر صاحب نے رشید سے اپنا قلم لے کر رجسٹر کھولا اور حاضری لینا شروع کی۔ رشید اپنی سیٹ پر واپس آیا۔ پروفیسر صاحب نام پکار رہے تھے کہ ایک زبردست دھماکا پوری کلاس میں گونج کر رہ گیا۔ اخلاق صاحب نے چونک کر سر اٹھایا۔ ساتھ ہی پوری کلاس کی نظریں بھی ساتویں قطار کی طرف اٹھ گئیں جہاں رشید اپنی سیٹ سے غائب تھا اور ٹھیکل جھک کر کچھ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر سب نے دیکھا کہ ٹھیکل جسے اٹھا رہا تھا وہ کوئی اور شے نہیں رشید ہی تھا جس کے ہونٹوں پر ایک کھسیانی مسکراہٹ چمکی ہوئی تھی۔

”یہ کیا ہوا بھئی۔“ پروفیسر اخلاق صاحب نے پوچھا۔

”میں کرسی سے گر گیا تھا سر۔“ رشید نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

”ہوں۔“ اخلاق صاحب نے ٹھیکل کو گھورا۔ ”کیا نام ہے تمہارا صاحبزادے۔“

”سر ٹھیکل احمد۔“

”سر ٹھیکل احمد۔“ پروفیسر صاحب نے دہرایا۔

”وہ۔۔۔ سر۔۔۔ میرا مطلب تھا کہ میرا نام ٹھیکل احمد ہے۔“

”یہ رشید کیسے گرا۔“

”کرسی گر گئی تھی سر۔“

”کرسی گر گئی تھی یا تم نے شرارت کی تھی۔“
 ”میں نے کچھ نہیں کیا سر۔“ ٹکیل نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”میں نے تو صرف کرسی تبدیل کی تھی۔“

”ہوں۔“ اخلاق صاحب نے سر ہلایا۔ ”تو تم نے صرف کرسی تبدیل کی تھی۔ میں پوچھ سکتا ہوں کیوں؟“

”بات یہ ہے سر۔“ ٹکیل نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”کہ رشید صاحب میرے لیے ایک تاریخی کرسی لائے تھے جس پر ان کے بقول شہنشاہ تیمور لنگ نزول اجلاس فرمایا کرتے تھے اور جو ان کے بعد سکندر یونانی، چنگیز خان، بابر ہمایوں جیسی شخصیتوں کے زیر استعمال تھی اور جسے دیکھ کر شاہجہاں کو تخت طاؤس بنوانے کا خیال آیا تھا۔“

”کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو صاحبزادے۔“ اخلاق صاحب نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تیمور لنگ کے بعد سکندر اور اس کے بعد چنگیز خان۔ یہ تم نے کونسی تاریخ میں دیکھا ہے۔“

”میں نے نہیں سر، غالباً رشید نے دیکھا ہے۔ یہ بیان ان کا ہی ہے۔“ ٹکیل نے سادگی سے جواب دیا۔ ”یہ تاریخ کے طالب علم ہیں۔ میں ان کے بیان پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ تو سر جب رشید نے مجھے اس کرسی کی تاریخ بتائی تو میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ میں خود اس نادور و نایاب کرسی پر تشریف رکھوں اور میرے عزیز دوست ایک معمولی کرسی پر بیٹھیں۔ میری دوستی کا تقاضا تھا کہ یہ سعادت میں اپنے بجائے انہیں پیش کروں اور میں نے یہی کیا۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے یہ خیال بعد میں آیا کہ یہ کرسی تیمور لنگ کی ہے تو وہ ضرور اسی سے گر کر لنگڑا ہوا ہو گا۔“

کلاس میں ایک شور مچا گیا۔ لڑکے اور لڑکیاں پروفیسر صاحب کی موجودگی کے باوجود قہقہے لگانے سے باز نہ رہ سکے۔ ایک قول کے مطابق پروفیسر اخلاق حسین کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دیکھی گئی جسے ضبط کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر آخر کار وہ کلاس سے باہر چلے گئے۔ ویسے یہ دوسری بات ہے کہ گھنٹا بھی اسی وقت ختم ہو گیا تھا۔

شہناز پروین کے ساتھ کلاس سے باہر نکلی تو کچھ فاصلے پر قیصر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ پروین شہناز کی بہت پرانی سہیلی تھی۔ دونوں اسکول کے زمانے ہی سے ایک ساتھ تھیں۔ ایک دوسرے کو بخوبی سمجھ چکی تھیں اس لیے خاصی بے تکلف تھیں۔ اتنی کہ اس بے تکلفی کی وجہ سے کبھی کبھی جھگڑا بھی ہو جاتا تھا جو چوبیس گھنٹے سے زیادہ شاید ہی کبھی باقی رہا ہو۔ دوسرے دن دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر منسا شروع کر دیتیں اور بس جھگڑا ختم۔

”تمہارا یہ پیریڈ تو خالی ہے۔“ قیصر نے شہناز کے قریب آنے پر پوچھا۔

”جی نہیں یہ تاریخ کا گھنٹا ہے۔“ پروین نے جواب دیا۔

”میں نے آپ سے نہیں پوچھا۔“ قیصر نے ناگواری سے کہا۔

”ہاں صاحب ہماری ایسی قسمت کہاں کہ آپ کبھی ہم سے بھی کوئی بات کر لیں۔“

پروین نے ٹھنڈی سانس بھری۔

قیصر نے غور سے پروین کی طرف دیکھا۔

”تو آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی بات کروں۔“ اس نے پوچھا۔

”میں ہی کیا کالج کی ہر لڑکی یہ چاہتی ہے کہ آپ اس سے بات کریں کوئی ایسی بات کہ

ہمیں دوبارہ اپنے جوہر دکھانے کا موقع مل سکے۔“ پروین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ خود سوچئے کتنے دن ہو گئے کہ کالج میں ہنسنے ہانسنے والا کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا۔ آپ

جیسے ہیرو کی موجودگی میں یہ افسوس ناک بات ہے۔“

پروین کا اشارہ دراصل گزشتہ سال کے ایک واقعے کی جانب تھا جس کے بارے میں

کہا جاتا تھا کہ قیصر اور اس کے دوستوں نے چھٹی کے بعد فرسٹ ایئر کی ایک لڑکی کو

چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ کچھ لڑکیاں اور آگئیں اور ان سب نے

مل کر قیصر اور اس کے دوستوں کی اچھی خاصی مرمت کر دی تھی۔ واقعہ چونکہ کالج کے باہر

ہوا تھا اور پھر ایک روایت کے مطابق قیصر نے لڑکیوں کے ہاتھ پیر جوڑ کر معافی مانگ لی تھی

اس لیے بات آگے نہ بڑھی۔ مگر یہ کہ کم سے کم وہ لڑکیاں تو جانتی ہی تھیں جن کے سینڈل

ٹوٹے تھے اور پروین ان میں سے ایک تھی۔
 ”میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ مجھے کم سے کم شہناز کی موجودگی میں تو بلیک میل کرنے کی کوشش نہ کیا کریں۔“ قیصر نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا۔
 ”آپ یہ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ میرا یہ پیریڈ خالی ہے یا نہیں۔“ شہناز بولی۔
 ”اچھا بھی ہم تو چلے۔“ پروین نے شہناز کو مخاطب کیا۔ ویسے خدا نخواستہ ضرورت پڑ جائے تو آواز دے لیتا۔ ہماری کلاس وہ سامنے ہے۔“ پروین مسکراتی ہوئی چلی گئی۔
 ”سنا ہے آج کل تمہارے یہاں کوئی مہمان آئے ہوئے ہیں۔“ قیصر نے پوچھا۔
 ”جب آپ کل شام امی سے مل کر سب کچھ معلوم کر آئے ہیں تو میرا سر کھانے کی کیا ضرورت ہے۔“ شہناز نے جواب دیا اور پارک کی طرف چلنے لگی۔
 ”خوب تو تم گھر پر موجود تھیں اس کے باوجود تم نے گلشن سے کہلوادیا کہ باہر گئی ہوئی ہو۔“

”ظاہر ہے جب انسان ملنا نہ چاہے تو بہانہ بنانا ہی پڑتا ہے۔“
 ”پہلے تو تمہیں کبھی بہانے بنانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔“ قیصر نے کچھ طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ”اس کی وجہ عدنان صاحب کو سمجھا جائے یا فکیل صاحب کو۔“
 ”آپ کا گھٹیا ذہن اس کے علاوہ اور سوچ بھی کیا سکتا ہے۔“ شہناز نے ترشی سے کہا۔ ”مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس دن سے عدنان صاحب آئے ہیں میری ان سے صرف ایک ملاقات ہوئی ہے۔“
 ”اس طرف کہاں جا رہی ہو؟“

”لا بیری۔“

”میرے ساتھ کافی پینے نہیں چل سکتیں۔“

”جی نہیں۔“

”گویا مجھے بھی لا بیری چلنا پڑے گا۔“

”لا بیری پڑھے لکھے سنجیدہ مزاج لوگوں کے لیے ہوتی ہے۔ آپ وہاں جا کر بیکار اپنا

وقت ضائع کریں گے۔“

”تمہارے ساتھ جو وقت گزارا جائے وہ ضائع نہیں ہوتا۔“

”ممکن ہے آپ کا نہ ہوتا ہو مگر میرا وقت تو یقیناً ضائع ہوتا ہے۔“ شہناز لا بھری جاتے جاتے ایک دم پارک کی طرف گھوم گئی۔

”تم تو لا بھری جا رہی تھیں۔“

”جی ہاں، مگر اب ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔“

”گویا میرے ساتھ کافی پیئے چل رہی ہو۔“

”جی نہیں وہ ارادہ نہیں فیصلہ تھا اور میں اپنے فیصلے نہیں بدلا کرتی۔“

پارک میں ٹکیل اپنی مخصوص بیچ پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

”خوب۔ تو یہاں آنے کی وجہ ٹکیل صاحب تھے۔“ قیصر نے طنز کیا۔

”غالبا اب تو آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں گے۔“ شہناز نے جواب دیا اور بیچ کی طرف

بڑھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ”ہیلو ٹکیل صاحب تو آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔“

”اوہ آپ؟“ ٹکیل گڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ ”مگر میں چھپا تو نہیں بیٹھا تھا۔“

”شاید آپ بھول گئے۔“ شہناز مسکرائی۔

”کیا؟“ بڑی حیرت سے ٹکیل نے پوچھا۔

”کہ آپ نے اس خالی پیریز میں مجھے کافی پیئے کی دعوت دی تھی۔“

”میں نے!“ ٹکیل نے اور زیادہ حیرت سے کہا۔

”ارے صاحب اگر نہیں دی تھی تب بھی ایسے موقع پر آپ کو انکار نہیں کرنا

چاہیے۔“ قیصر نے طنز کیا۔ ”کالج کی حسین ترین لڑکی آپ کے ساتھ کافی پیئے کی خواہش

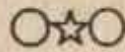
مند ہے اور آپ ہچکچا رہے ہیں۔ جائے مس شہناز کو کافی ہاؤس لے جائیے۔“

شہناز نے تیز نگاہوں سے قیصر کو دیکھا۔

”خفا مت ہو، میں جا رہا ہوں۔“ قیصر ترش لہجے میں بولا۔ ”اگر تمہارا موڈ اس وقت

بندر نچانے کا ہے تو میں نخل نہیں ہوں گا۔“

”آئیے کلیل صاحب چلیں۔“ شہناز اس کا ہاتھ پکڑ کر چل دی۔
 ”مگر۔۔۔ میرے پاس کافی پلانے کے لیے پیسے نہیں ہیں شہناز صاحبہ۔“ کلیل
 کچھ آگے بڑھ کر بڑی بے چارگی سے بولا۔
 ”شہناز نے جلدی سے گھوم کر قیصر کی طرف دیکھا۔
 ”مگر شاید قیصر نے یہ بات نہیں سنی تھی۔ وہ وہیں کھڑا غصیلی نظروں سے شہناز اور
 کلیل کو گھور رہا تھا۔ شہناز نے ایک گہری سانس لی۔
 ”آپ بالکل بدھو ہیں کلیل صاحب۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”چلئے تو سہی پیسے
 میں دے دوں گی۔“
 ”پھر ٹھیک ہے۔“ کلیل نے اطمینان سے سر ہلایا اور ایک لمحہ رک کر سوچتے ہوئے
 پوچھا۔ ”یہ قیصر صاحب بندر نچانے کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے۔ کالج میں بندر کا
 تماشا بھی ہوا کرتا ہے کیا؟“



قیصر اور امجد کالج کے گیٹ کے قریب ہی ایک درخت کی آڑ میں کھڑے تھے۔
 ”میں سمجھتا ہوں کہ تم بے کاری پریشان ہو رہے ہو۔“ امجد نے کہا۔ ”کوئی لڑکی جس کے ہوش و حواس درست ہوں ٹھیک جیسے جو کر کو پسند نہیں کر سکتی۔“
 ”مجھے لڑکیوں کا تجربہ تم سے زیادہ ہے۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”عورت ابتدائے آفرینش سے مرد کے مقابلے میں زبردست احساس کمتری میں مبتلا ہے۔ اس نے تاریخ کے ہر دور میں یہ کوشش کی ہے کہ جہاں کہیں اسے موقع ملے وہ مرد کو اپنے چشم و ابرو کا غلام بنا کر رکھے۔ مگر ہزار ہا برس کی طویل جدوجہد نے اسے بتا دیا ہے کہ وہ ایک نارمل مرد کے مقابلے میں شاذ و نادر ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آج کل کی لڑکیاں ہوشیار اور ذہین لڑکوں کے مقابلے میں احمق قسم کے لڑکوں کو اس لیے پسند کرتی ہیں کہ انہیں اپنے اشاروں پر نچانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کرنی پڑتی اور پھر ٹھیک تو اچھا خاصا خوبصورت بھی ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر یہ شہناز کا مذاق بھی ہے تو وہ کہیں آگے چل کر سیریس نہ ہو جائے۔“

”پھر کیا ارادہ ہے۔“ امجد نے پوچھا۔
 ”میں چاہتا ہوں کہ ٹھیک کو اتنا تنگ کیا جائے کہ وہ گھبرا کر یہاں سے کسی اور کالج میں چلا جائے۔“

”وہ آرہا ہے۔“ امجد نے آہستہ سے کہا۔
 قیصر نے گھوم کر دیکھا ٹھیک کتابیں ہاتھ میں لیے سر جھکائے کالج کی طرف آرہا تھا۔
 ”السلام علیکم ٹھیک صاحب۔“ اس کے قریب آنے پر قیصر نے درخت کی آڑ سے سامنے آتے ہوئے کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ ٹھیک نے ناگواری سے جواب دیا۔
 ”شاید آپ ہم لوگوں سے ناراض ہیں۔“ قیصر اس کے ساتھ ہی چلنے لگا۔
 ”میرا خیال ہے ٹھیک صاحب کو ابھی تک یہ غلط فہمی ہے کہ ان کے روپے ہم نے لیے تھے۔“ امجد بولا۔

”اس میں ٹھیک صاحب کا کوئی قصور نہیں۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”میں نے اس معاملے کی تصدیق کی تو پتا چلا کہ واقعی کچھ ایسے ہی حالات تھے کہ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا یہ ہی سوچتا۔“

”کیسے حالات۔“ ٹھیک نے چونک کر پوچھا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ پرسوں سے کالج کا سالانہ فیسٹیول ویک شروع ہو رہا ہے۔“

قیصر نے جواب دیا۔

”مجھے معلوم ہے مگر فیسٹیول ویک کا ان باتوں سے کیا تعلق۔“ ٹھیک نے اعتراض

کیا۔

”بہت بڑا تعلق ہے ٹھیک صاحب۔“ قیصر نے بتایا۔ ”فیسٹیول ویک میں ایک ڈرامہ

بھی ہوتا ہے اور اس مرتبہ ہم شیکسپیر کا مشہور ڈرامہ دی کامیڈی آف دی ٹو برادر اسٹیج کر رہے ہیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گا اس ڈرامے میں دو بھائیوں کی داستان بیان کی گئی ہے جو بالکل ایک دوسرے کے ہم شکل تھے اور۔“

”اگر آپ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہوں کہ اسی طرح وہ شخص جس نے مجھ سے روپے لیے تھے آپ نہیں بلکہ آپ کا کوئی ہم شکل تھا۔“ ٹھیک نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تو میں اسے بالکل تسلیم نہیں کروں گا۔ اول تو ایسی تخیل چیزوں کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نے آج تک کوئی دو انسان ایسے نہیں دیکھے جو ایک دوسرے کا عکس واقع ہوئے ہوں۔ دوسرے ایک لمحے کے لیے اس امکان کو مان بھی لیا جائے تو یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ ایک نہ دو پورے تین افراد کے ہم شکل موجود ہوں۔ میں نے صرف آپ کو تو نہیں دیکھا تھا آپ کے ساتھ امجد صاحب اور مجیب صاحب بھی تھے۔“

”آپ نے میری پوری بات تو سنی ہوتی۔“ قیصر نے برا مانے بغیر جواب دیا۔ ”در اصل ہم نے دونوں بھائیوں کا میک اپ کرنے کے لیے مقامی فلم اسٹوڈیو سے رجوع کیا تو وہاں سے تین میک اپ مین بھیج دیئے گئے۔ تینوں کو اپنے اپنے فن کا دعویٰ تھا۔ چنانچہ ان میں سے کون بہتر ہے اس کو ثابت کرنے کے لیے ان سے کہا گیا کہ ہر ایک اپنے اپنے کمال کا

نمونہ پیش کرے۔ جواب میں انہوں نے تین لڑکوں کو میری اور مجیب صاحب کی شکل کا بنا دیا۔ بد قسمتی سے وہ تینوں لڑکے کالج کے سب سے زیادہ شریر لڑکے تھے انہوں نے اس موقع سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ جانے کتنے لوگوں کو اپنی شرارت کا نشانہ بنا ڈالا۔ آپ تو اپنے ڈیڑھ سو روپے کو رو رہے ہیں انہوں نے تو ہمارے گھر والوں کو بھی نہیں چھوڑا۔

”میرا ہم شکل میرے گھر پہنچ گیا اور میری امی سے تین سو روپے مار لایا۔ امجد صاحب جب شام کو گھر پہنچے اور چھوٹے بھائی سے پوچھا کہ بھیا تم میری اسکوٹر کا پتھر درست کرا لائے تو معلوم ہے کیا جواب ملا۔“

”کیا جواب ملا۔“ شکیل نے دلچسپی سے پوچھا۔

”چھوٹے بھائی بولے۔ بھائی جان آپ خود ہی تو دوپہر کو آکر اسکوٹر لے گئے تھے۔“

امجد نے جواب دیا۔

شکیل نے ایک ہلکا سا تھقہ لگایا۔ اب وہ اپنا غصہ وغیرہ سب بھول چکا تھا۔

”گویا وہ امجد صاحب کا ہم شکل اسکوٹر لے اڑا۔“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”جی۔ اور ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے؟“ قیصر نے جواب دیا۔ ”اس نے اسکوٹر لے جا کر مجیب صاحب کے ہم شکل کو دے دیا۔ مجیب صاحب کی ایک جگہ منگنی ہو چکی ہے۔ وہ بد معاش میرا مطلب ہے مجیب صاحب کا ہم شکل اسکوٹر لے کر وہاں پہنچ گیا۔ بہانے سے ان کی منگیتر کو بلایا۔ اس غریب کو کیا معلوم کہ یہ کون ہے، وہ آگئی اور جناب وہ حضرت نمائش، کلب، سینما اور پتا نہیں کہاں کہاں اسے لے کر، خوب گھومے پھرے اور رات گیارہ بجے گھر چھوڑ گئے۔“

”واقعی یہ تو ان لوگوں نے بڑی زیادتی کی۔“ شکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پھر کیا انہیں کوئی سزا نہیں دی گئی۔“

”سزا کیا دی جاتی ان کا کہنا تھا کہ ہم تو اپنا میک اپ آزار ہے تھے۔“

قیصر نے جواب دیا۔ ”بہر حال جو روپے انہوں نے ادھر ادھر سے جھپٹ لیے تھے ان میں سے آدھے وہ خرچ کر چکے تھے۔ آدھے متعلقہ افراد کو واپس کر دیے گئے۔ آپ کی رقم

ہمیں پہلے سے علم نہیں تھا۔ مگر یقین رکھیے میں ان سے پوری رقم اگلا کر رہوں گا۔
 ”یہ تو واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں نے غلط ہی سمجھا تھا۔“ ٹکیل بولا۔ ”بہر حال
 میں آپ لوگوں سے معذرت خواہ ہوں۔ غصے میں کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکل گئی ہو تو
 عاف کر دیں۔“

”ارے چھوڑیے معافی کیا۔ آپ کی غلط فہمی دور ہو گئی یہی بہت بڑی بات ہے۔“
 صبر نے کہا۔ ”اور دیکھا جائے تو معافی ایک طرح سے ہمیں مانگنا چاہیے۔ آپ کی رقم تو بچ
 دھوکے سے حاصل کی گئی تھی مگر ہم پہلے ہی سمجھتے رہے کہ آپ خواہ مخواہ ہم پر الزام لگا
 رہے ہیں۔“

”میں تجویز کرتا ہوں کہ اس ملاپ کی خوشی میں قیصر صاحب ٹکیل صاحب کو ایک
 شاندار دعوت دیں۔“ امجد بولا۔

”مجھے منظور ہے۔“ قیصر نے جلدی سے کہا۔

”میرا خیال ہے دعوت اس وقت ہونا چاہیے جب مجھے روپے واپس مل جائیں۔ اور
 یہ دعوت باہمی چندے سے ہونا چاہیے۔ آخر جب ہم میں سے قصور کسی کا بھی نہیں تو
 دعوت کا جرمانہ کسی ایک پر کیوں ہو؟“

”جیسی آپ کی خوشی۔ ورنہ یہ دعوت میرے لیے جرمانہ نہیں انعام ہوتی کہ ہمارے
 ملحقہ احباب میں آپ جیسے مخلص دوست کا اضافہ ہوا ہے۔“ قیصر نے کچھ مایوسی ظاہر کی۔
 ”سچ کہہ رہے ہیں۔“ ٹکیل نے یوں کہا جیسے دفعتاً اس پر کسی نئی بات کا انکشاف ہوا
 ہو۔ ”میں نے اس پہلو سے غور نہیں کیا واقعی مجھ جیسا مخلص دوست آپ لوگوں کے لیے
 انعام سے کم نہیں۔ نہیں صاحب آپ ضرور دعوت کریں بلکہ پورے کلاس کی دعوت
 کریں۔“

”بس تو پھر طے رہا کہ فیشیول ویک کے بعد ایک شاندار دعوت ہوگی۔“ امجد نے ہنستے
 ہوئے کہا۔

”یہ آپ کا کون سا پیریڈ ہے؟“ قیصر نے پوچھا۔

”معاشیات کا۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔

”کون سے پروفیسر پڑھا رہے ہیں۔“ امجد نے سوال کیا۔

”چتا نہیں ابھی تک تو کوئی صاحب آئے نہیں ہیں۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ غالباً چشتی صاحب ہی آپ کی کلاس لیں گے۔“ قیصر نے بتایا۔

”پھر تو ٹکیل بھائی آپ معاشیات چھوڑ کر کوئی اور مضمون لے لیں۔“ امجد نے کہا۔

”کیوں بھائی؟“ بڑی حیرت سے ٹکیل نے پوچھا۔

”در اصل چشتی صاحب بڑے عجیب و غریب پروفیسر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ماہر

تعلیم معاشیات سے زیادہ اوٹ پٹانگ مضمون اب تک ایجاد نہیں کر سکے چنانچہ یہ

صرف ان طالب علموں کی سمجھ میں آسکتا ہے جو غیر معمولی طور پر اوٹ پٹانگ ذہن

مالک ہوں۔“ اس کے لیے وہ اپنے پہلے لیکچر میں طلباء کا امتحان لیتے ہیں جو لڑکا ان کے مختار

سوالات کے جتنے زیادہ بے تکلف جوابات دے گا اتنا ہی پسندیدہ قرار پائے گا۔ ظاہر

آپ سیدھے سادے شریف نوجوان ہیں۔ آپ کوشش بھی کریں تو غلط جواب نہیں

دے سکتے اور ایسے لڑکے ان کی کلاس میں ہمیشہ پچھلی سیٹوں پر بٹھائے جاتے ہیں۔“

”اگر بات صرف اتنی ہے تو آپ فکر نہ کریں میں جواب دے لوں گا۔“ ٹکیل

مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ بہتر جانتے ہیں۔ ہم نے تو دوست سمجھ کر ایک مشورہ دیا تھا۔“ قیصر نے جواب

دیا۔

ٹکیل نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور چونک گیا۔

”ارے۔“ وہ بولا۔ ”باتوں باتوں میں وقت گزرتا ہوا معلوم ہی نہیں ہوا۔ گیارہ بج

پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔ پیریڈ شروع ہو چکا ہوگا۔ اب اجازت چاہوں گا، قیصر صاحب

ملاقات ہوگی۔“

”جی ہاں، ضرور۔“ قیصر نے جواب دیا۔

ٹکیل دونوں سے ہاتھ ملا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ اس کی نظروں

و جمل ہوتے ہی قیصر اور امجد نے ایک ساتھ بڑا زوردار قہقہہ لگایا۔

”تو دوست معاشیات کا انتظام تو میں نے کر دیا۔“ قیصر ہنستے ہوئے بولا۔ ”قریشی صاحب سے ایک جھڑپ ہو جائے پھر وہ سال بھر تک صاحب زادے کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔“

”آج کلاس میں ہونے والا ڈرامہ دیکھنے اور سننے کے قابل ہو گا۔“ امجد نے جواب

دیا۔

”وہ تو پہلا ہی سین ہو گا۔“ قیصر نے کہا ”مزہ تو اس وقت آئے گا جب اس ڈرامے کا

دوسرا منظر آج کالج کی مسجد میں اسٹیج کیا جائے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”تم نے نوٹ نہیں کیا کہ ہمارے فکیل صاحب واقعی مولانا ہیں اور بڑی باقاعدگی سے

تقریر عصر کی نمازیں کالج کی مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔“

”تو پھر!“

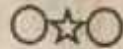
”تو پھر یہ کہ وہاں اسلامیات کے پروفیسر صدیقی صاحب سے بھی دو دو ہاتھ کرا دیے

جائیں گے۔“

”وہ کس طرح؟“

”او کافی ہاؤس چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر اطمینان سے کوئی ترکیب سوچیں گے۔“ قیصر

نے جواب دیا۔



ٹکیل کلاس میں داخل ہوا تو قریشی صاحب حاضری لے کر رجسٹر بند کر رہے تھے۔
 ”ادھر تشریف لائیے۔“ انہوں نے ٹکیل کو آواز دی۔
 ”فرمائیے۔“ ٹکیل میز کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔
 ”آپ کی تعریف۔“

”اب میں اپنے منہ سے اپنی کیا تعریف کروں سر۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔
 قریشی صاحب نے ناک کی پھنگی پر رکے ہوئے چشمے میں سے بڑے غور سے ٹکیل دیکھا۔

ٹکیل نے ہاتھ اٹھا کر بڑے اطمینان سے اپنا چشمہ بھی ناک کی نوک پر رکھا اور اس کے شیشوں سے جھانکتے ہوئے بولا۔
 ”جی۔“

”جناب میں آپ کا نام پوچھ رہا ہوں۔“
 ”ٹیکسپنٹر کہتا ہے کہ سر نام میں کیا رکھا ہے۔ اس کے برعکس ایک اردو شاعر کا قول ہے کہ بدنام نہ ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ اسی مضمون کو مرزا غالب نے یوں ادا کیا ہے کہ وہ بھی کہتے ہیں یہ بے ننگ و نام ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلے میں کارل مارکس یا کسی اور ماہر معاشیات کا قول مجھے یاد نہیں ورنہ وہ بھی سنا دیتا۔“

”عجیب آدمی ہو جی تم۔“ پروفیسر کو غصہ آگیا۔ ”سیدھی طرح اپنا نام نہیں بتا سکتے۔“
 ”بتا سکتا ہوں سر۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔ ”سیدھی الٹی دونوں طرح بتا سکتا ہوں۔“
 ”تو بتاؤ۔“

”سیدھی طرح یا الٹی طرح؟“
 ”لاحول ولاقوة“ پروفیسر صاحب جھلا کر بولے۔ ”میاں کسی طرح بتا بھی چکو۔“
 ”الٹی سیدھی کی ابتدا آپ نے کی تھی سر اس لیے اب جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ۔۔۔۔۔“

”چلو سیدھی طرح بتا دو۔“ پروفیسر صاحب زچ ہو کر بولے۔

”فکیل احمـ۔“

”تو مسٹر فکیل احمـ آپ کو معلوم نہیں کہ گھنٹا کس وقت شروع ہوتا ہے۔“

”کون سا گھنٹا سر؟“

”معاشیات کا گھنٹا اور کون سا؟“

”معلوم ہے سر۔“

”پھر آپ اتنی دیر سے کیوں آئے؟“

”اگر آپ اس گفتگو کا ٹائم گھنٹا دیں تو کچھ ایسی زیادہ دیر نہیں بچے گی۔“

”مگر میں اپنے پیریڈ میں ایک منٹ کی تاخیر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“ پروفیسر صاحب میز پر گھونسا مار کر بچھے۔ ”اگر کل سے تم لیٹ آئے تو کلاس سے باہر نکال دیا جائے گا۔“

”کس کو؟“

”تمہیں اور کس کو۔“ پروفیسر صاحب نے دو سرا گھونسا مارا۔

”اگر ایک میز کرسی بھی باہر نکال دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ آپ خود

سوچئے کہ گھنٹا بھر کھڑے رہ کر لپکھڑا ہوتا تو بڑا مشکل ہوگا سر۔“

”تو تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ گدھے۔۔۔ پاجی۔۔۔ الو۔۔۔“ پروفیسر صاحب مارے

غصے کے بول نہیں پار رہے تھے۔

”سرا ایک معاشیات کے پروفیسر کی زبان سے یہ غیر معاشرتی گالیاں کچھ اچھی نہیں

معلوم ہوتیں۔“

”او۔۔۔ یو۔۔۔ یو۔“ پروفیسر صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کون سی انگریزی گالی دیں

گرج کر بولے۔ ”گیٹ آؤٹ۔“

”تھینک یو سر۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہوگا۔“ فکیل نے

اطمینان کی سانس لی اور اپنی سیٹ کی طرف چل دیا۔

”اے مسٹر۔“ پروفیسر صاحب چلائے۔ ”میں نے تمہیں باہر نکلنے کا حکم دیا ہے۔“

”ختم بھی کیجئے سر۔“ فکیل جیسے اکتا کر بولا۔ ”ممکن ہے میرے اوٹ پٹانگ جوابات

آپ کو بہت پسند آئے ہوں مگر اب کسی دوسرے لڑکے کو بھی موقع دیجئے۔ اس کلاس میں

بڑے بڑے بزنس بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”کیا بک رہے ہو؟“ پروفیسر صاحب نے حیرت سے ٹکیل کو گھورا۔

”شاید آپ اس لیے حیران ہیں کہ میں نے نیا نیا ایڈمیشن لیا ہے۔ کلاس میں بھی دیر سے آیا ہوں اس کے باوجود مجھے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ آپ معاشیات کو اوٹ پٹانگ بکنگ کہتے ہیں اور اپنے پہلے پیریڈ میں لڑکوں کا امتحان لیتے ہیں کہ کون زیادہ سے زیادہ الٹے سیدھے جوابات دے کر اپنے آپ کو معاشیات کا اہل ثابت کرتا ہے۔“

قریشی صاحب ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت قسم کے پروفیسر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ٹکیل کے مضحکہ خیز جوابات پر پوری کلاس ہنسی سے بے تاب ہونے کے باوجود آواز نکالنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ مگر یہ ٹیپ کا بند ان کی برداشت سے باہر ثابت ہوا اور ایک دم سے قہقہوں کا رکا ہوا سیلاب بہہ نکلا۔ ایک دو منٹ تک وہ شور مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ٹکیل کے آخری جواب اور اس سے زیادہ اس کے حلقے کے پیش نظر قریشی صاحب کو یہ سمجھتا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہا تھا کہ کسی ہوشیار لڑکے نے اسے احقر بنایا ہے۔“

”تو اسی لیے تم میرے سوالات کے جوابات غلط دینے کی کوشش کر رہے تھے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ ٹکیل خوش ہو کر بولا۔ ”مگر سرگستاخی معاف۔ اگر آپ کالج میں آنے کے بجائے فلم لائن کی طرف نکل جاتے تو بڑے بڑے کیریئر ایکٹروں کا چراغ گل ہو جاتا۔ سچ کہتا ہوں سر آپ کا غصہ اتنا حقیقی معلوم ہو رہا تھا کہ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کلاس سے بھاگنے سے باز رکھ سکا ہوں۔“

کچھ اور قہقہے بلند ہوئے اور اس مرتبہ ان میں پروفیسر قریشی کے جھپٹے ہوئے قہقہے کی آواز بھی شامل تھی۔



کالج کی مسجد کے صحن میں کھڑے ہوئے قیصر اور امجد نے اسلامیات کے پروفیسر صدیقی صاحب کو مسجد کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔
 ”یار صدیقی صاحب تو آگئے مگر تمہارے جو کر کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔“ امجد نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر اس کے آنے سے پہلے انہوں نے وضو کرنا شروع کر دیا تو بہت برا ہوگا۔“

”اب تک اسے آجانا چاہیے تھا۔“ قیصر نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے خیال سے ہم لوگ کچھ دیر صدیقی صاحب کو باتوں میں لگالیں تو اچھا ہے۔“ وہ دونوں صدیقی صاحب کی طرف بڑھے ہی تھے کہ شکیل بھی آگیا۔ صدیقی صاحب کسی اور لڑکے سے باتیں کرنے لگے تھے۔

”کیا مصیبت ہے۔“ قیصر بڑبڑایا۔ ”وہ احمق آگیا تو پروفیسر صاحب انک گئے۔“ شکیل نے وضو کرنے کے لیے اپنا ڈھیلا ڈھالا کوٹ اتار کر ایک چٹائی پر رکھا اور ننگوں کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے شاید ابھی تک قیصر اور امجد کو نہیں دیکھا تھا۔
 ”السلام علیکم سر۔“ قیصر نے صدیقی صاحب کے قریب آتے ہوئے کہا۔
 ”وعلیکم السلام۔“

”سر کیا ظہر کی نماز کا وقت کچھ بڑھا دیا گیا ہے۔“ قیصر نے پوچھا۔ صدیقی صاحب نے چونک کر اپنی گھڑی دیکھی۔

”اوہ۔ ڈیڑھ بج گیا۔“ انہوں نے کہا اور جلدی جلدی شیروانی کے بٹن کھولنے لگے۔ شیروانی اتار کر انہوں نے اپنی رسٹ واچ بھی کلائی سے کھول کر شیروانی کی جیب میں ڈال دی اور وضو کرنے چل دیے۔ جو لڑکا ان سے باتیں کر رہا تھا وہ کچھ الگ ہٹ کر سنتیں پڑھنے لگا۔

”لو دوست۔“ قیصر نے سرگوشی کی۔ ”تم اپنا کام کرو میں وضو کرنے جا رہا ہوں۔“
 امجد نے بڑی ہوشیاری سے صدیقی صاحب کی جیب سے گھڑی نکالی اور گھوم کر ننگوں
 کی طرف دیکھا۔ ٹھیکل ابھی وضو ہی کر رہا تھا۔ وہ بڑے سرسری انداز میں ٹمٹما ہوا اس جگہ
 پہنچا جہاں ٹھیکل نے اپنا کوٹ رکھا ہوا تھا۔ قیصر نے اپنا کوٹ بھی اتار کر وہیں ڈال دیا تھا۔
 امجد نے اپنا کوٹ اتارا اور جب اسے چٹائی پر رکھنے کے لیے جھکا تو بڑی صفائی سے صدیقی
 صاحب کی رسٹ وایج ٹھیکل کے اندرونی کوٹ کی جیب میں منتقل کر دی۔
 ٹھیکل وضو کر کے اٹھا تو قیصر بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ روٹھے ہوئے ہیں۔“ قیصر نے اس کے پھولے ہوئے
 منہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں اور اب لعنت ہے اس شخص پر جو کبھی آپ سے بات بھی کرے۔“ ٹھیکل
 نے بگڑے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

”کیوں بھی میرا قصور؟“

”قصور۔ آج معاشیات کے گھنٹے میں پوری کلاس کے سامنے میرا مذاق اڑایا گیا ہے
 اور یہ محض آپ کی وجہ سے۔“
 ”وہ کیسے؟“

”وہ الٹی پٹی مجھے آپ نے ہی تو پڑھائی تھی کہ چشتی صاحب۔“
 ”ایک منٹ۔“ قیصر نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ ”پہلے یہ بتائیے کہ جو
 پروفیسر صاحب کلاس لے رہے تھے ان کا رنگ کالا تھا۔“
 ”نہیں تو۔ مگر۔۔۔۔۔“

”ان کے گھنگریالے بالوں کی ٹیس پیشانی پر جھوم رہی تھیں۔“
 ”بالکل نہیں وہ تو بڑی حد تک فارغ البال تھے۔“
 ”اور وہ بار بار اپنی سرمہ لگی آنکھیں منکا منکا کر لڑکیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔“
 ”چشتی کے پیچھے کوئی بھلا اپنی آنکھیں کیسے منکا منکا کرتا ہے۔“ ٹھیکل نے جواب دیا۔

”خواہ سرمہ لگا ہو یا نہ لگا۔“

”اوہ۔ میں سمجھ گیا۔“ قیصر نے جلدی سے کہا۔ ”وہ چشتی صاحب نہیں قریشی صاحب ہوں گے۔“

”تو۔“ ثکیل نے اپنا کوٹ اٹھا کر پہنتے ہوئے پوچھا۔

”تو یہ کہ میں نے جو بات آپ کو بتائی تھی وہ چشتی صاحب کے لیے تھی اور آپ قریشی صاحب کی کلاس میں اس پر عمل کر بیٹھے۔ ظاہر ہے نتیجہ وہی نکلتا چاہیے تھا جو نکلا۔“ قیصر نے جواب دیا اور خود بھی جھک کر اپنا کوٹ اٹھالیا۔

”لاحول ولا قوۃ“ ثکیل نے بڑی شرمندگی سے کہا۔ ”اور میں خواہ مخواہ آپ سے بدگمان ہو رہا تھا کہ آپ نے دانستہ میرے ساتھ شرارت کی تھی۔“

”کوئی بات نہیں اکثر غلط فہمی ہو جاتی ہے۔“ قیصر کوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے بولا۔

”کوئی بات نہیں، کیسے؟ ضرور آپ دل میں مجھے برا بھلا کہہ رہے ہوں گے۔“

”ارے نہیں ثکیل بھائی کیا ذرا سی بات۔۔۔۔۔“

”پھر بھی جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے مجھے اطمینان نہیں ہوگا۔“ ثکیل نے بات کاٹی۔

”چھا بھی معاف کیا بس۔“

”اس طرح نہیں۔“

”تو پھر؟“

”وہ تو سنا ہوگا آپ نے جب گلے سے مل گئے سارا گلہ جاتا رہا۔“ ثکیل نے جواب دیا۔ ”جب تک آپ مجھ سے بغل گیر نہیں ہوں گے مجھے یقین نہیں آئے گا کہ آپ نے مجھے دل سے معاف کر دیا ہے۔“

قیصر مسکراتے ہوئے ثکیل کے گلے لگ گیا۔

”بس اب تو خوش۔“ وہ الگ ہوتے ہوئے بولا۔ ”اور جلدی کیجئے وہ دیکھیے جماعت

کھڑی ہو ابی چاہتی ہے۔“

دونوں صفوں کی طرف لپکے۔ صدیقی صاحب تکبیر کہہ چکے تھے۔ انہوں نے بھی جلدی سے نیت باندھی اور آخری صف میں کھڑے ہو گئے۔

نماز سے فارغ ہو کر صدیقی صاحب نے رست و اچ نکالنے کے لیے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو گھڑی غائب تھی۔ پہلے انہوں نے تمام جیبوں میں تلاش کیا پھر جہاں شیروانی رکھی تھی وہاں جا کر دیکھا کہ شاید جیب سے نکل کر گر پڑی ہو۔

”کیا بات ہے؟“ امجد نے پوچھا۔

”میری گھڑی نہیں مل رہی ہے۔“ صدیقی صاحب نے جواب دیا۔

”گھڑی!“ امجد نے چونکنے کی اداکاری کی۔ ”اوہ مجھ پہلے ہی شبہ ہوا تھا۔“

”کیا شبہ ہوا تھا۔ کس پر شبہ ہوا تھا۔“ صدیقی صاحب سیدھے کھڑے ہو گئے۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میاں صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔“

”سرسر۔۔۔ وہ۔۔۔ میں نے شکیل صاحب کو یہاں سے جھک کر کچھ اٹھاتے دیکھا تھا۔“

امجد ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”کون شکیل؟“

”وہ دیکھیے! وہ صاحب جو دروازے پر اپنے جوتے پہن رہے ہیں۔“ امجد نے اشارے سے بتایا۔

”بلا کر لاؤ اسے۔“ صدیقی صاحب نے جلدی سے کہا۔

”شکیل صاحب۔“ امجد نے مسجد کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے آواز دی۔

”کیا بات ہے؟“ قیصر نے پوچھا جو شکیل کے قریب ہی کھڑا تھا۔

”صدیقی صاحب شکیل کو بلا رہے ہیں۔“ امجد نے بتایا۔

”مجھے! شکیل نے چونک کر کہا۔ ”مگر کیوں؟“

”تمہارا نام شکیل ہے؟“ صدیقی صاحب خود بھی لپکتے ہوئے پہنچ گئے۔

”جی ہاں۔“

”تم نے میری گھڑی لی ہے۔“

”میں نے! نہیں تو سر۔“ ٹکیل گھبرا کر بولا۔ اس کی گھبراہٹ سے صدیقی صاحب کا شبہ یقین کی حد تک پہنچ گیا۔

”میں تمہاری تلاشی لینا چاہتا ہوں۔“ وہ بولے۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سر۔ میں چور نہیں ہوں۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔

”اس صورت میں تمہیں اپنی تلاشی دینے میں کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔“

”خوف کی بات نہیں سر، عزت کا سوال ہے۔ اتنے لڑکوں میں آپ نے مجھے ہی تلاشی

دینے کے لیے کیوں کہا۔“ ٹکیل نے بدستور خوفزدہ چہرے کے ساتھ جواب دیا۔ ”آپ

میری تلاشی لینا چاہتے ہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اب یہاں

سے کوئی فرد تلاشی دیے بغیر نہیں جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔“ صدیقی صاحب نے جواب دیا۔

ٹکیل نے اپنا کوٹ اتار کر صدیقی صاحب کے سامنے ڈال دیا قیص اور پتلون کی

جیبیں الٹ کر دکھادیں۔

صدیقی صاحب نے خود کوٹ کی تلاشی لی۔ مگر گھڑی نہیں مل سکی۔ امجد اور قیصر حیران

و پریشان نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

”اب تم اپنی تلاشی دو۔“ صدیقی صاحب نے امجد کو گھورا۔ وہ خاموشی سے صدیقی

صاحب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ تلاشی لی گئی مگر گھڑی اس کی جیبوں میں بھی نہیں تھی۔

”میری تلاشی بھی لے لیجئے سر۔“ قیصر خود ہی آگے بڑھ گیا۔ ایک جیب، دوسری

جیب، تیسری جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ صدیقی صاحب چونک گئے۔ دوسرے ہی لمحے ان

کا ہاتھ ایک جھٹکے سے باہر نکل آیا۔

”یہ کیا ہے؟“ انہوں نے بڑے طنزیہ لہجے میں اپنی رسٹ واچ قیصر کی آنکھوں کے

سامنے ہلاتے ہوئے کہا۔

قیصر کی پھٹی پھٹی آنکھیں رسٹ اینڈ کی قیمتی رسٹ واچ پر گڑی ہوئی تھیں اور چہرہ فق

ہو چکا تھا۔

”بولتے کیوں نہیں۔“ صدیقی صاحب گرجے۔ ”یہ تمہاری جیب میں کیسے پہنچی۔“
 ”مم۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ کچھ نہیں جانتا سر۔“ قیصر ہکھلایا۔ ”میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے آپ کی گھڑی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“ شاید کسی نے شرارتا میری جیب میں ڈال دی ہے۔“

”ہوں۔“ صدیقی صاحب نے گہری سانس لی۔ ”صاحب زادے اگر میں تمہیں اور تمہارے والد صاحب کو جانتا نہ ہوتا تو اسی وقت کالج سے نکلوا دیتا۔ میرا خیال ہے شاید تم۔۔۔۔۔ ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔“

انہوں نے لڑکوں کی طرف رخ کیا جو اس وقت تک خاصی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔
 ”تم میں سے کس نے یہ شرارت کی تھی۔“ انہوں نے بلند آواز سے پوچھا۔ سب خاموش رہے۔

”میں صرف اس کا نام جانتا چاہتا ہوں، اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔“
 پھر بھی سب خاموش کھڑے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔
 ”مجھے معلوم ہے وہ تم میں سے ہی کوئی لڑکا ہے۔“ صدیقی صاحب نے کہا اور پھر کچھ رک کر بولے۔ ”بہر حال یہ بہت بری حرکت ہے اور خدا کے گھر میں اس کا ارتکاب اور بھی قابل ملامت ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی شرارتوں سے اجتناب کیا جائے گا۔“

صدیقی صاحب مسجد سے نکلے تو دوسرے لڑکے بھی آپس میں کانٹا پھوسی کرتے ہوئے اپنی اپنی کلاسوں کی طرف چل دیے۔ قیصر امجد کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔
 ”یہ تم نے کیا کیا احمق آدمی۔“ اس نے انتہائی غصے سے کہا۔ ”میں نے تم سے ٹکیل کی جیب میں گھڑی ڈالنے کے لیے کہا تھا اور تم نے میری جیب میں ڈال دی۔“

”چاہے جیسی بھی قسم لے لو قیصر بھائی۔“ وہ بولا۔ ”میں نے گھڑی ٹکیل کی جیب میں ہی ڈالی تھی۔“

امجد نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔ اسے قیصر کا غصہ معلوم تھا اور یہ بھی کہ وہ کالج کا

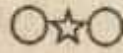
بہترین باکسر ہے، ایک دو گھونے بھی مار دیئے تو اس کی چٹنی بن جائے گی۔
”میری سمجھ میں خود یہ معمہ نہیں آیا۔“

قیصر کی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”میں تو کہتا ہوں بھیا تم اس ٹکلیل کا پیچھا چھوڑ ہی دو۔“ امجد نے کچھ ٹھہر کر کہا۔ ”تم نے دو مرتبہ اسے زک پہنچانے کی کوشش کی اور دونوں مرتبہ اس کے بجائے الٹا تمہیں نقصان پہنچ گیا۔“

”بزدلی کی باتیں مت کرو۔“ قیصر جھلا کر بولا۔ ”میں اس ٹکلیل کے بچے کو کالج سے نکلوا کر دم لوں گا۔ پرسوں سے فینسیول ویک شروع ہو رہا ہے۔ تم کسی طرح اسے باکسنگ کے مقابلے میں شریک ہونے پر آمادہ کر لو۔۔۔۔۔ پھر میں اسے دیکھ لوں گا۔“

امجد نے خوفزدہ نگاہوں سے قیصر کی طرف دیکھا اور کانپ کر رہ گیا۔ آج قیصر کی آنکھوں میں اسے وہی چمک دکھائی دے رہی تھی جو اس نے اس روز دیکھی تھی جب وہ مقصود سے مقابلے کے لیے رنگ میں اتر ا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا تھا کہ مقصود چوتھے راؤنڈ میں جو گرا تو تین ماہ تک اسپتال کے بلیک سے نہیں اٹھ سکا تھا اور یہ صرف اتنی سی بات پر کہ کسی نے قیصر سے کہہ دیا تھا کہ مقصود اور شہناز کو کافی ہاؤس میں ساتھ ساتھ دیکھا گیا تھا۔



امجد کالج کے گیٹ پر کھڑا ہوا ٹکیل کے باہر آنے کا منتظر تھا۔ گیٹ کے اندر کچھ فاصلے پر قیصر اپنی سیکنڈ ہینڈ کار میں بیٹھا ہوا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس نے عقبی آئینے میں دور سے ٹکیل کو مجیب کے ساتھ آتے دیکھا اور کار کا ہارن بجا کر امجد کو بھی ہوشیار کر دیا کہ ٹکیل مجیب کے ساتھ باتیں کرتا چلا آ رہا تھا۔

”آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے ٹکیل صاحب۔“ مجیب کہہ رہا تھا ”کہ قدرت نے آپ کو بہترین تحلیل جسم دیا ہے۔ یہ اونچا قد، چوڑا سینہ، بھرے بھرے بازو۔ سچ کہتا ہوں آپ ذرا سی توجہ دیں تو ہر ٹکیل میں کالج کے چیمپئن بن سکتے ہیں۔“

”مگر مجھے پڑھائی کے علاوہ کبھی کسی چیز کا شوق نہیں رہا۔“

”میں نے کہا جناب ٹکیل صاحب۔“ امجد کی آواز آئی۔

ٹکیل نے پلٹ کر دیکھا اور امجد کو دیکھ کر رک گیا۔

”معلوم ہے میں یہاں پورے ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔“

امجد نے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال تھا آج آپ کا آخری پیریڈ خالی ہوتا

ہے۔“

”پیریڈ تو خالی تھا مگر یہ مجیب صاحب پکڑ کر پلے گراؤنڈ لے گئے۔“ ٹکیل نے جواب

دیا۔ ”میں نے دیکھا کہ انتظامات تو بڑے اعلیٰ پیمانے پر کیے گئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے

بین الاقوامی نہیں تو کم از کم بین الصوبائی مقابلے ضرور ہو رہے ہیں۔“

”جی ہاں! کوشش تو ہماری یہی ہے کہ یونیورسٹی بین الکیاٹی مقابلے منعقد کرانے کے

لیے ہمارے کالج کا انتخاب کرے۔“ امجد نے جواب دیا۔ ”یہ بتائیے آپ نے بھی کسی

مقابلے میں نام دیا۔۔۔ یا نہیں۔“

”جی ہاں!“ ٹکیل مسکرایا۔ ”میں یہ مقابلہ دیکھنے والوں کے مقابلے میں شریک ہونے

کا ارادہ کر رہا ہوں۔“

”اسی وقت پیچھے سے کار کا ہارن سنائی دیا اور فوراً ہی قیصر کی کار ان لوگوں کے قریب آکر رک گئی۔

”ارے بھی کہاں تھے امجد۔“ قیصر نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔ ”میں تمام کالج میں تمہیں تلاش کر کے آ رہا ہوں۔“

”پھر تو آپ کو بڑی زحمت ہوئی ہوگی۔“ امجد نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”زحمت تو یقیناً ہوئی۔“ قیصر نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”اچھا چلو آؤ بیٹھو۔“

”شکریہ میں آج پیدل ہی گھر چلا جاؤں گا۔“ امجد کے لہجے میں تلخی تھی۔

”کیا بات ہے کچھ ناراض معلوم ہوتے ہو۔“

”میں ایک چھوٹا سا غریب آدمی، آپ جیسے بڑے آدمی سے کیسے ناراض ہو سکتا ہوں۔“

”تو تم نہیں چل رہے ہو۔“

”جی نہیں۔۔۔۔۔ بہت بہت شکریہ۔“

”تمہاری مرضی۔“ قیصر نے بڑے زور سے دروازہ بند کیا اور کار آگے بڑھ گئی۔

”کیا قیصر صاحب سے کچھ جھگڑا ہو گیا۔“ کلیل نے پوچھا۔

”جھگڑا۔“ امجد نے بڑی تلخی سے دہرایا۔ ”میرا دل نہیں چاہتا کہ میں اس شخص کی

صورت بھی دیکھوں۔ آپ کو معلوم ہے اس نے مسجد سے نکلنے کے بعد کیا کہا تھا۔“

”کنے لگا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ ساری شرارت کلیل کے بچے کی ہے۔ یا تو اس نے

خود میری جیب میں گھڑی رکھی ہوگی یا کسی سے رکھوائی ہوگی۔“

”یہ کلیل کا بچہ کون ہے۔“ کلیل نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

”ارے بھیا۔ اس نے آپ کو کہا تھا۔“

”مجھے! مگر میں تو عقیل کا بچہ ہوں! میرا مطلب ہے میرے والد صاحب کا نام عقیل

ہے۔“

”آپ بہت بھولے ہیں فکیل صاحب۔“ عجیب ہنسنے لگا۔ ”یہ غصے یا نفرت کے ساتھ کسی کا ذکر کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔“

”اچھا بڑا عجیب طریقہ ہے۔“ فکیل نے حیرت سے کہا۔ ”بہر حال قیصر صاحب کا کہنا غلط ہے وہ گھڑی نہ میں رکھی تھی اور نہ کسی سے رکھوائی تھی۔“

”تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بات وہ خود نہیں جانتا۔“ امجد بولا۔ ”اچھی طرح جانتا ہے مگر اپنے دل کی بھڑاس آخر اور کیسے نکالتا۔“

”بھئی سچ پوچھو تو قیصر صاحب کا جلنا ایک طرح سے ہے تو حق بجانب ہے۔“ عجیب نے شوخ لہجے میں کہا۔

”کیوں بھائی میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔“ فکیل نے چونک کر پوچھا۔

”جناب آپ کا سب سے بڑا قصور تو یہ ہے کہ آپ شہناز صاحبہ کو کافی پلانے لے گئے تھے۔“ امجد ہنس کر بولا۔

”میں کب لے گیا تھا امجد بھائی۔“ فکیل نے جلدی سے گھبرا کر کہا۔ ”وہ تو خود ہی ضد کر کے میرے ساتھ گئی تھیں۔ خدا کی قسم کافی کا بل بھی انہوں نے ادا کیا تھا۔ یقین نہ آئے تو چلو کافی ہاؤس کے ویٹر سے پوچھ لو۔“

”بہر حال آپ لے گئے ہوں یا شہناز صاحبہ آپ کو لے گئی ہوں۔ اس کی گواہی تو ہم بھی دے سکتے ہیں کہ جب سے آپ نے کالج میں داخلہ لیا ہے وہ ایک مرتبہ بھی قیصر کے قریب نہیں گئیں۔“ عجیب نے کہا۔

”مارے یا رنجھ سے پوچھو نا۔ تمہیں کیا معلوم تم نے تو کامرس لے رکھی ہے۔“ امجد بولا۔ ”میں ایسی سیٹ پر بیٹھتا ہوں جہاں سے شہناز صاحبہ اور فکیل صاحب دونوں کو بخوبی دیکھا سکتا ہوں۔ سچ کہتا ہوں میں نے جب بھی نگاہ اٹھا کر دیکھا شہناز صاحبہ کو ان ہی کی طرف دیکھتے پایا۔“

”اور ہمارے فکیل صاحب۔“ عجیب نے شرارت سے کہا۔ ”بتا دوں۔“ امجد نے اسے آنکھ مارتے ہوئے فکیل کی طرف دیکھا۔

”تم لوگوں کو تو بات کا بھٹکڑنا خوب آتا ہے۔“ ٹکیل بری طرح شرمارہا تھا۔
”کیا عورتوں کی طرح شرمارہے ہیں بھائی صاحب۔“ مجیب بولا۔ ”آخر مان کیوں نہیں
کہ آپ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“
”میں اگر اقرار کر بھی لوں تو بھی کیا فرق پڑتا ہے۔“ ٹکیل نے ایک ٹھنڈی سانس
لی۔ ”وہ ٹھہری لکھ پتی باپ کی بیٹی۔“
”محبت دولت کی بھوکی نہیں ہوتی ٹکیل صاحب۔“ امجد نے کہا۔ ”اگر آپ چاہیں تو
چٹکی بجاتے شہناز آپ کی بن سکتی ہے۔“
”میں جانتا ہوں کہ شہناز کے والد شاکر حسین صاحب بہت وسیع النظر اور معقولیت
پر انسان ہیں۔“ امجد نے جواب دیا۔ ”باصلاحیت نوجوان کی بہت قدر کرتے ہیں۔ آپ
مائی میں تو پہلے ہی ماشاء اللہ بہت تیز ہیں اگر کھیل کے میدان میں بھی تھوڑا نام پیدا
میں تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ شاکر صاحب آپ کو مسترد نہیں کر سکتے۔“
”بھئی واللہ کیا بات کی ہے۔“ مجیب اچھل پڑا۔ آج کل موقع بھی بہترین ہے۔ آپ
میں نہ کوئی کھیل تو آتا ہوگا ٹکیل صاحب۔“
”ہاں! کیوں نہیں لوڈو بڑی عمدہ کھیلتا ہوں۔“ ٹکیل نے فخریہ لہجے میں کہا۔
”لوڈو تو بڑا عظیم کھیل ہے کسی چھوٹے موٹے کھیل کا نام بتائیے جو ہمارے کالج میں
نہ ہو۔“ مجیب نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔
”سانپ سیڑھی۔“ ٹکیل نے جلدی سے کہا۔
”میرا مطلب تھا لانگ چپ، ہائی چپ، ویٹ لفٹنگ، ہمپر تھرو وغیرہ۔“ مجیب نے کہا۔
”یا پھر ہاکی، فٹ بال، کرکٹ، باکسنگ میں سے کوئی کھیل۔“ امجد بولا۔
”خوب یاد دلایا امجد بھائی۔“ مجیب نے جوش کے ساتھ کہا۔ ”قیصر صاحب کو اپنی
سنگ پر بہت ناز ہے اگر ہمارے ٹکیل صاحب قیصر صاحب کو ناک آؤٹ کر دیں تو میں لکھ
دینے کو تیار ہوں کہ پھر شہناز کی شادی کہیں اور ہو ہی نہیں سکتی۔“
”باکسنگ۔“ ٹکیل جیسے سم گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے گھونے بازی۔ یہ بھی کوئی کھیل

ہے ایسی ویسی جگہ گھونسا پڑ جائے تو بس گئے کام سے۔“

”آپ سمجھتے کیوں نہیں۔“ امجد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”قیصر صاحب دولہا بعد دو ہی چیزوں پر بہت اکر تے ہیں ایک باکنگ اور ایک باؤلنگ۔ اگر آپ ان دونوں ان کے دانت کھٹے کر دیں تو قیامت تک ان کی دال نہیں گل سکتی۔“

”باؤلنگ۔“ ٹھیل چونکا۔ ”یہ کون سا کھیل ہے کہیں اس کا تعلق کسی کے باؤل سے تو نہیں۔“

”کرکٹ کی گیندیں پھینکنے کو کہتے ہیں۔“ امجد نے بتایا۔ ”قیصر فاسٹ بالر ہیں بہت دور سے دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور بہت تیز گیندیں پھینکتے ہیں۔“

”یہ کچھ آسان معلوم ہوتا ہے۔“ ٹھیل نے پر جوش ہو کر کہا۔ ”گیندیں پھینکنے معاملہ ہے تو میں ان سے کہیں زیادہ تیز پھینک کر دکھاؤں گا اور ایسی جگہ پھینکوں گا کہ کوئل بھی نہ سکیں۔“

”کیا آپ نے کبھی کرکٹ کا کوئی میچ نہیں دیکھا۔“ مجیب نے پوچھا۔

”دیکھا کیوں نہیں ہے۔“ ٹھیل نے فوراً جواب دیا۔ ”آپ اسی کھیل کی کر رہے ہیں نا جس میں دو آدمیوں کو بہت سارے آدمی گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں پھر آدمی ایک طرف سے ٹاک ٹاک کر گیندیں مارنا شروع کر دیتا ہے جو کبھی ان کے گلتیں کبھی بلے سے ٹکرا جاتی ہیں اور کبھی ان تین لکڑیوں سے جنہیں شاید وکٹ کہتے ہیں۔ پھر جب ایک طرف آدمی مارتے مارتے تھکے جاتا ہے تو دوسری طرف کا آدمی مار لگتا ہے۔“

”جی ہاں۔ اسی کو باؤلنگ کہا جاتا ہے۔“ امجد نے بتایا۔

”گویا قیصر صاحب میرے گیندیں ماریں گے۔“ ٹھیل نے کہا۔ ”خیر کوئی بات دیکھا جائے گا۔“

”تو کرکٹ ٹیم میں آپ کا نام دے دیا جائے۔“ مجیب نے پوچھا۔

”وہ تو دے ہی دیا جائے گا مگر مقابلہ تو باکنگ کا ہے۔“ امجد نے جلدی سے کہا۔

”جب تک قیصر صاحب کے ہلدی چوٹا نہ تھپ جائے مزہ نہیں آئے گا۔“

”امجد صاحب آپ لوگ کیوں میرا کوٹہ اکرانے کی فکر میں ہیں۔“ ٹکیل نے بے
 کسی سے کہا۔ ”مجھے گھونے بازی بالکل نہیں آتی۔ قیصر صاحب کے ہلدی چونائیے تھے
 میرے جسم پر پلاسٹرابتہ چڑھ جائے گا۔“

”آپ تو یوں ہی گھبرارہے ہیں۔“ امجد نے کہا۔ ”باکسنگ کا تمام کھیل ہمت اور پھرتی
 ہمت کی آپ میں کمی نہیں۔ رہی پھرتی تو وہ کوئی مشکل بات نہیں۔ دو چار معرکے
 دیکھیں آپ کو بتادیں گے۔“

”ذرا یہ بھی تصور کیجئے کہ جب آپ قیصر کو ناک آؤٹ کر کے رنگ سے باہر آئیں گے
 تاز صاحب کا سر فخر سے کتنا اونچا ہو جائے گا۔“

”کتنا اونچا ہو جائے گا۔“ ٹکیل نے سادگی سے پوچھا۔ ”اتنا اونچا کہ پھر آپ کے علاوہ
 نگاہ کسی پر نہیں ٹھہرے گی۔“ عجیب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”پورے کالج میں دھوم مچ جائے گی آپ کی کہ آپ نے قیصر جیسے تجربہ کار باکسر کو ناک
 کر دیا۔“ امجد بولا۔

”یہ ناک آؤٹ والی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ ٹکیل نے الجھتے ہوئے کہا۔
 ”کیجئے نہ لگ سکا ناک پر کوئی گھونسا تو کان آؤٹ یا منہ آؤٹ وغیرہ سے کام نہیں چل
 “

”افوہ۔“ امجد نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ ”آپ کی بھی کیا باتیں ہیں بھائی میرے،
 کوٹ ہونے کا مطلب ہوتا ہے کہ حریف مقابلے کرنے کے قابل نہ رہے اور ہار مان
 “

”خواہ ایک بھی گھونسا ناک پر نہ پڑا ہو۔“ ٹکیل نے مزید تصدیق کرنا چاہی۔
 ”جی ہاں۔“

”اچھا تو پھر آپ لوگ اگر اتنے بغض ہیں تو کر دیجئے اعلان کہ میں باکسنگ میں قیصر
 کا مقابلہ کروں گا۔“

”زندہ باد۔“ امجد نے جواب دیا اور دونوں زور سے قہقہے مارنے لگے۔

قیصر کی درپردہ کوششوں کے نتیجے میں ٹھیکل کا نام نہ صرف کرکٹ ٹیم میں بلکہ
 کے مقابلوں میں بھی شامل کر لیا گیا۔ اس مرتبہ فینسبول ویک کمیٹی نے ایک ندرت کی
 بجائے مختلف کلاسز کی ٹیموں کے، مختلف مضامین پڑھنے والوں کی ٹیمیں تیار کی گئی تھیں
 اردو، انگریزی، معاشرتی علوم، سائنس، حساب اور اسی طرح تمام دوسرے مضامین
 ٹیموں کے درمیان مقابلے ہوتا تھے۔ یہی فائنل اور فائنل کے علاوہ باقی تمام میچ تیس
 اووروں کی بنیاد پر کھلائے گئے۔ یہی فائنل میں پہنچنے والی چار ٹیموں میں اردو کی
 آرٹ ٹیم کو اور انگریزی کی ٹیم نے تاریخ کی ٹیم کو ہرا کر فائنل میں کھیلنے کا اعزاز
 کیا۔ گویا فائنل میں اردو اور انگریزی ٹیموں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ ٹھیکل اردو کی ٹیم میں
 تھا اور قیصر انگریزی کی ٹیم کا کھلاڑی تھا۔ ٹھیکل کو دسویں نمبر پر رکھا گیا تھا۔ اس لیے
 تک کے تمام میچوں میں اسے صرف یہی فائنل میں کھیلنے کا موقع مل سکا تھا جس میں
 ناٹ آؤٹ رہا۔ نہ کوئی رن بنایا اور نہ آؤٹ ہوا۔ آرٹ کی ٹیم پہلے کھیل چکی تھی اور
 نے ایک سو انیس رن بنائے تھے۔ بد قسمتی سے اردو کی ٹیم کے کھلاڑی بھی کوئی اچھا
 نہ کر سکے اور جب ان کا نواں وکٹ گرا تو ایک سو تین رن بنے تھے۔ اوپنر رشید احمد
 جما ہوا تھا اور اس کا ذاتی اسکور چالیس رن تھا۔ جب ٹھیکل الٹائیٹ بندوق کی طرح
 پر رکھ کر بیٹنگ کے لیے چلا تو بڑی تالیاں بجائی گئیں۔ کریز پر پہنچا تو رشید نے سمجھا
 صرف دو گیندیں رہ گئی ہیں وہ تم کسی طرح کھیل جاؤ اگلے اوور میں میں انہیں سمجھ
 ہٹ وغیرہ مارنے کی کوشش مت کرنا۔ بس وکٹوں کے آگے بلا رکھے کھڑے رہنا اور
 نے اس کی ہدایت پر بڑی سعادت مندی سے عمل کیا۔ باؤلر نے پہلی گیند پھینکی، وکٹ
 کوئی دو فٹ دور مگر ٹھیکل اس طرح بیٹ کریز پر رکھے رہا جیسے وہ سیدھی وکٹ میں
 ہو۔ دوسری پھینکی تو وہ سچ مچ ناک کی سیدھ میں آئی، بہت تیز تھی۔ بلے پر لگی تو بلا
 ٹیڑھا ہو گیا اور بال تیر کی طرح باؤلڈری کی طرف جانے لگی کہ ایک کھلاڑی نے روک

اتنی دیر میں ٹھیک صاحب بھاگ کر دوسری طرف پہنچ چکے تھے مگر رشید رن بنانے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ اس کا مطلب ہوتا کہ دوسرا دور بھی ٹھیک کے لیے صحیح معنوں میں بلے پڑتا اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ خوش قسمتی تیسری گیند پر بھی ٹھیک کا ساتھ دے گی۔ چنانچہ اس نے اسے واپس بھیج دیا۔ ادھر ٹھیک بھاگا ادھر گیند پکڑنے والے کھلاڑی نے گیند وکٹوں میں دے ماری۔ لوگوں نے شور مچا دیا۔ ”اوٹ“ مگر پھر ہٹا نہیں کیا ہوا کہ جو بال اچھی خاصی وکٹوں میں جا رہی تھی یوں برابر سے کئی کترا کر نکل گئی جیسے سوشلسٹ کسی مرد مومن کو دیکھ کر راستہ بدل دیتا ہے۔ دو کھلاڑی اس کے پیچھے بھاگے اور ٹھیک ایک مرتبہ پھر رشید کی طرف دوڑا۔ رشید اب بھی اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجبوراً بے چارے کو پھر لوٹنا پڑا اور اس مرتبہ گلیاں اڑی گئی تھیں مگر ایسا پڑنے فیصلہ دیا کہ ٹھیک پہلے پہنچ چکا ہے۔ غرض یہ بھاگ دوڑ تو کافی ہوئی مگر رن ایک بھی نہیں بنا۔ دوسرے دور میں رشید نے واقعی لگا تار تین چوکے دو دگیاں اور ایک اکامار کر میچ جیت لیا۔ واپس آکر پیڈ کھولتے ہوئے ٹھیک نے اعلان کیا کہ اب خواہ کچھ ہو جائے وہ رن بنانے کے لیے کبھی نہیں بھاگے گا۔

فیسبول کے چوتھے دن اردو اور انگریزی کی ٹیموں کے درمیان فائنل میچ کھیلا گیا۔ کالج کی بیشتر لڑکیاں بھی میچ دیکھ رہی تھیں جن میں شہناز اور پروین بھی شامل تھیں۔ یہ ایک انگ کی بنیاد پر کھیلا جا رہا تھا۔

اردو کی ٹیم نے ٹاس جیتا اور ٹھیک شروع ہوا۔ قیصر واقعی بڑی تباہ کن باؤلنگ کرتا تھا لیچ سے پہلے سات کھلاڑی بیک ٹوپولین ہو چکے تھے جس میں سے پانچ وکٹ قیصر نے لیے تھے اور اسکور تھا صرف نناوے۔ لیچ کے بعد آٹھواں وکٹ بھی اسی اسکور پر گر گیا۔ یہ وکٹ بھی قیصر نے لیا تھا اور ابھی اوور کی چار گیندیں باقی تھیں۔ کپتان کو مجبوراً ایک مرتبہ پھر ٹھیک کو بھیجنا پڑا۔

ٹھیک نے کریز پر پہنچ کر سب سے پہلے تو مجیب سے ہاتھ ملایا جو ایسا رنگ کر رہا تھا اور پھر اس کے بعد ابھی چاک سے کریز کا نشان تازہ کر کے بلا کریز پر رکھ ہی رہا تھا کہ شوں سے

کوئی چیز آئی اور بڑے زور سے بیٹ سے ٹکرائی۔ ٹکلیل نے احتجاج کرنے کے لیے منہ کھولا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ ریڈی تو ہو جانے دیا ہوتا مگر نگاہ اٹھا کر دکھا تو مجیب باؤنڈری کا سنگٹل دے رہا تھا۔ چو کا خواہ مخواہ لگ گیا۔ دیکھنے والوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔ قیصر نے دل ہی دل میں سِلپ کے کھلاڑی کو گالی دی۔ یہ اس کی پہلی گیند تھی جس نے باؤنڈری لائن پار کی تھی۔

ادھر ٹکلیل اس انداز سے بیٹ ہلا رہا تھا جیسے گاف کھیلنے والے اپنی چھڑی ہلاتے ہیں۔ چلتے وقت اسے اردو ٹیم کے کپتان نے بے شمار ہدایات دی تھیں مگر آج وہ کسی کی پرواہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ قیصر نے معمول سے کچھ اور لمبا اشارت کیا۔ وہ گیند کو اس زاویے سے پھینکنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اچھل کر سیدھی ٹکلیل کے سر پر لگے۔ وہ بھاگتا ہوا آیا اور پوری طاقت سے گیند پھینکی۔ گیند گولی کی طرح چلی، بیچ سے ٹکرائی اور اچھل۔ ٹکلیل نے سر خطرے میں دیکھ کر جلدی سے بلے کی آڑ میں کر لیا۔ کھٹ سے ایک دھماکا خیز آواز بلند ہوئی۔ بیٹ زور کا جھٹکا کھا کر گھوم گیا اور پبلک چیخ پڑی واہ کیا شاندار ہک لگایا ہے۔ درمیان میں کئی کھلاڑیوں نے گیند دبوچنے کے لیے ہائی جമ്പ لگائی مگر بے کار۔ گیند پولیسین کے اس حصے میں آکر گری جہاں شہناز بیٹھی تھی۔ یہ ایک شاندار چھٹکا تھا۔

اور پھر قیصر جیسے غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے باقی دونوں بال ایسے خطرناک طریقے پر بپھر پھینکیں کہ دیکھنے والے ہونٹک کرنے لگے مگر نتیجہ ان دونوں کا یہ نکلا کہ چار چار کر کے اردو کی ٹیم کو بائی کے آٹھ رنز اور مل گئے۔ ایک اوور میں اٹھارہ رن۔ قیصر نے ایسا پارے کے ہاتھ سے اپنی کیپ لی بلکہ چھین لی اور یوں پلٹ کر چلا کہ دیکھنے والے یہی سمجھے کہ وہ جھلا کر گراؤنڈ سے باہر جا رہا ہے مگر وہ باؤنڈری لائن پر اپنی پوزیشن پر آکر رک گیا۔

اگلا اوور ٹکلیل کے ساتھی کھلاڑی نے یوں ہی گزار دیا۔ گویا میڈان رہا۔ قیصر آستین چڑھاتے ہوئے اس انداز سے آگے بڑھا جیسے اس مرتبہ وہ ٹکلیل کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ دانت پیستے ہوئے وہ اس طرح بھاگا جیسے وہ اس مرتبہ گیند کے بجائے خود ہی ٹکلیل کا سر توڑنے پہنچ جائے گا۔ جسم و جان کی پوری طاقت سے گیند پکڑے وہ بھاگتا ہوا آیا اور چاہتا

کر سکے۔ پوری ٹیم دو سو باؤن رن پر آؤٹ ہو گئی۔ ٹکلیل کا اپنا اسکور ایک سو بتیس رن تھا۔ ٹکلیل شامیہ نے میں پہنچا تو شہناز اور پروین مبارک باد دینے والوں میں سب سے پیش پیش تھیں۔

”آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔“ شہناز بہت زیادہ خوش نظر آرہی تھی۔
 ”میرا خیال ہے اب قیصر صاحب باؤننگ سے توبہ کر لیں گے۔“ پروین بھی بولی۔
 ”خدا ان کی توبہ قبول کرے۔“ ٹکلیل نے پیڑ کھولتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تو بس ان کی گیندوں سے اپنا سر بچانے کی کوشش کرتا رہا۔“ دو سری طرف قیصر اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

”بھلا کسے معلوم تھا کہ یہ احمق آدمی اتنا اچھا کھلاڑی ثابت ہو گا۔“ مجیب نے کہا۔
 ”لا حول ولا قوۃ۔ تم اسے کھیل کہتے ہو۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”جو شخص بلا پکڑنا بھی نہ جانتا ہو وہ کھلاڑی کیسے ہو سکتا ہے بس قسمت کا دھنی کہہ لو ورنہ میری ایک گیند بھی پڑ جاتی تو سر کھل جاتا۔ کوئی بات نہیں کل باکسنگ کے مقابلے میں سارا حساب معہ سو دو وصول کر لوں گا۔“

”انگریزی ٹیم نے کھیل شروع کیا۔ تو تقریباً سوا دو گھنٹہ کا کھیل باقی تھا۔ بظاہر اندازہ یہی تھا کہ اتنے کم وقت میں اننگ ختم نہیں ہو سکتی اس لیے لازمی طور پر کل صبح بھی وقت دینا پڑے گا مگر اردو ٹیم کے اپنے اسرار نے تین اووروں میں پانچ وکٹ لے کر تھمکے مچا دیا۔ چھ وکٹ صرف انڈیا لیس رنز پر گر چکے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ چائے کے وقفے کے بعد انگریزی ٹیم کے کھلاڑیوں نے ٹک ٹک شروع کر دی تھی۔ اس وقت قیصر اور امجد کھیل رہے تھے۔ کئی باؤنر بد لے گئے مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ رن بھی آہستہ آہستہ بڑھتے جا رہے تھے اردو ٹیم کے کپتان کو خدا جانے کیا سوچھی کہ ٹکلیل کو بلا کر گیند اس کے ہاتھ میں پکڑادی۔

”کیا کروں میں اس کا۔“ ٹکلیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اب آپ باؤننگ کریں گے۔“

پکتان نے جواب دیا۔

”مگر مجھے باؤلنگ نہیں آتی۔“

”کوئی بات نہیں۔ کرنا شروع کریں گے تو آجائے گی۔“

”کھیل ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔ کھیل نے مجبوری کے انداز میں سر ہلایا، کیپ اتاری۔ مجیب کے پاس پہنچا۔ گیند اس کے ہاتھ میں دی اور کیپ اپنے ہاتھ میں لے کر قدم گننے لگا۔

”کیا کیپ سے باؤلنگ کرنے کا خیال ہے۔“ مجیب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اوہ! کھیل نے چونک کر اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا اور کیپ اس کے ہاتھ میں دے کر جانے لگا۔

”گیند تو لے لیں۔“

”لا حول ولا قوۃ۔“ کھیل بڑبڑایا۔ ”پتا نہیں میں کیوں اتنا گھبرایا جا رہا ہوں۔ باؤلنگ کرنا کوئی ایسی خاص بات تو ہے نہیں۔ بس بھاگتے ہوئے آئے اور گیند پھینک دی۔“

قریب کھڑا ہوا کھلاڑی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں! بالکل۔“ کھیل نے جواب دیا اور گیند لے کر نشان زدہ جگہ پر جا کھڑا ہوا۔

کھلاڑی اپنی اپنی پوزیشن پر ہوشیار ہو گئے کھیل نے نگاہ اٹھائی تو سامنے قیصر کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ کھیل کو تاؤ آ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو زور سے دو تین چکر دیئے اور اس طرح جیسے کوئی مٹھائی کا لٹو لیے بھاگ رہا ہو دوڑنا شروع کر دیا۔ وکٹوں کے قریب آکر گیند پھینک دی۔ قیصر نے اندازہ کر لیا کہ بال وکٹوں سے ایک گز دور سیدھے ہاتھ کی طرف جا رہی ہے، اس نے کریز سے نکل کر بیٹ گھمایا مگر نشانہ چوک گیا۔ گیند بیٹ کے کنارے سے ٹکرا کر اچھلی اور سلپ میں کھڑے ہوئے کھلاڑی نے بڑے اطمینان سے کیچ کر لیا۔

”ہاؤ ازاٹ۔ کھلاڑی اچھل پڑے۔ ایسا پار کی انگلی اٹھ گئی۔

ایک شور مچ گیا۔ قیصر آؤٹ ہو گیا تھا۔ اس نے انچاس رنز بنائے تھے۔

بے چارہ بچا سواں رن بنانے کی حسرت دل میں لیے سر جھکائے پولین کی طرف جانے لگا۔

”یہ قیصر صاحب کہاں جا رہے ہیں۔“ بڑی حیرت سے ٹکیل نے پوچھا۔
 ”آپ نے انہیں کیچ آؤٹ کر دیا۔“ ایک کھلاڑی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔
 ”اچھا کب؟“ اب بھلا کوئی اس کا کیا جواب دیتا۔ کپتان نے اس کی بیٹھ ٹھوکی۔
 ”بس تین اور رہ گئے۔“ اس نے ٹکیل کے کان میں چپکے سے کہا۔ ٹکیل نے سر ہلایا اور اگلی گیند بھینکنے کے لیے تیار ہو گیا۔

آنکھوں کھلاڑی آیا۔ ٹکیل نے گیند بھینکی۔ کھلاڑی کو یہ وکٹ کے بائیں جانب جاتی ہوئی نظر آئی وہ چاہتا تو آگے بڑھ کر ہٹ مار سکتا تھا مگر وہ قیصر کی طرح غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہیں کی اور ایک طنزیہ ہنسی کے ساتھ بلا سر کے اوپر اٹھا دیا۔ گیند بیچ سے ٹکرائی اور وائڈ جانے کے بجائے وکٹوں کی طرف گھوم گئی۔ کھلاڑی گھبرا کر بلا نیچے لایا مگر گلیاں تو اڑ چکی تھیں۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر پورا اسٹیڈیم سربراٹھا لیا۔ شہناز کی ہتھیالیاں سرخ ہو گئی تھیں۔

”کیا یہ بھی آؤٹ ہو گئے۔“ ٹکیل نے کھلاڑی کو واپس جاتے دیکھ کر عجیب سے پوچھا۔ ”کمال ہے۔“

نویس کھلاڑی نے دانت پیتے ہوئے ایک زوردار ہٹ ماری۔ گیند باؤنڈری لائن کے جانب چلی۔ تین کھلاڑی اس کے پیچھے بھاگے۔ دونوں کھلاڑیوں نے رن بنانا شروع کر دیے۔ ٹکیل وکٹ کیپر کے قریب کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ گیند کو باؤنڈری لائن سے پہلے پکڑ لیا گیا۔ ایک کھلاڑی نے پوری طاقت سے گیند وکٹ کیپر کی طرف بھینکی۔ وکٹ کیپر نے ہاتھ بڑھایا مگر گیند قابو میں نہیں آئی۔ ٹکیل نے یونی ہاتھ بڑھایا۔ گیند اس کی ہتھیلی سے آکر چپک گئی۔ وہ اطمینان سے دوسری جانب جانے لگا۔

”کیا کر رہے ہیں۔“ وکٹ کیپر چلایا۔

”مارئے۔“

”کے“ ٹھکیل نے پلٹ کر پوچھا۔ دوسرا کھلاڑی جان توڑ کر بھاگا چلا آ رہا تھا۔
 ”افوہ!“ وکٹ کیپر نے جھلا کر ٹھکیل کے گیند والے ہاتھ پر مارا گیند چھوٹ کر سیدھی
 وکٹوں سے ٹکرائی۔

”آؤٹ۔“ پیلر نے زور سے نعرہ لگایا۔
 ”معاف کیجئے گا۔“ ٹھکیل نے وکٹوں سے گری ہوئی بیلاٹھا کرایا پیار کے ہاتھ میں
 دیتے ہوئے کہا اور گھوم کر وکٹ کیپر سے بولا۔ ”یہ کیا حرکت تھی جناب۔“
 ”بڑے تک چڑھے لوگ ہیں۔“ وہ مجیب سے کہہ رہا تھا غلطی سے گلیاں گر گئیں تو
 اب اتنے خفا ہو گئے کہ کھیل گے ہی نہیں کمال ہے۔“

اور ادھر پیلر میں ہنگامہ مچا ہوا تھا تین گیندوں پر تین کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔
 انگریزی ٹیم بری طرح زور ہو چکی تھی۔ رن صرف ایک سو گیارہ بنے تھے اور نو وکٹ اڑ
 چکے تھے۔ شکست سامنے نظر آرہی تھی۔

دسواں کھلاڑی میدان میں پہنچا تو اس سے بیٹ نہیں پکڑا جا رہا تھا۔ ٹھکیل نے گیند
 پھینکی تو اس غریب نے چوکا مارنے کی پوری کوشش کی اب یہ قصور اس کا نہیں تھا کہ بلا گیند
 پر لگنے کے بجائے وکٹوں سے ٹکرا گیا۔



میچ ختم ہونے کے بعد شہناز نے ٹکلیل کو ہر چند تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر ہی نہیں آیا آخر دوسرے دن وہ پارک میں اپنی مخصوص بیچ کے قریب ایک درخت کی آڑ میں مل گیا۔ اس نے ایک شاخ پر ریت کا چھوٹا سا تھیلا لٹکا رکھا تھا اور اس پر مکے بازی کر رہا تھا۔ ”کل آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔“ شہناز نے حیرت سے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”غائب تو نہیں ہوا تھا۔ ہاں البتہ کالج سے چلا گیا تھا۔“
 ”وہی تو میں بھی معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ کہاں چلے گئے تھے۔“ شہناز نے کہا۔ ”میں بڑی دیر تک آپ کو تلاش کرتی رہی۔“
 ”کیوں؟“

”مبارک باد دینے کے لیے۔ آپ اتنا اچھا کھیلتے ہیں، ہمیں معلوم ہی نہیں تھا۔“
 ”کل اردو کی ٹیم محض آپ کی وجہ سے جیتی ہے۔“ وہ بولی۔ ”سچ کہتی ہوں اگر آپ باقاعدگی سے کرکٹ کھیلنے لگے تو اچھے اچھے کھلاڑی آپ کے سامنے پانی بھرنے لگیں۔“
 ”وہ تو اب بھی بھرتے ہیں۔“ ٹکلیل نے بتایا۔ ”بلکہ صبح و شام دونوں وقت بھرتے ہیں۔ لالہ زار کالونی میں ابھی گھروں میں پانی کے ٹل نہیں پہنچے ہیں۔ ایک دن ایک ٹنگ دھڑنگ صاحب خالی جانگیہ پہنے دونوں ہاتھوں میں بالٹی اٹھائے گھر سے باہر نکلے۔ برابر سے کسی نے آواز دی، کار گزار صاحب میری چار بالٹیاں لائن میں لگی ہیں۔ پہلے انہیں بھر جانے دیجئے گا۔ کہیں ان کی جگہ اپنی بالٹی اٹھا کر رکھ دیں۔ کار گزار صاحب نے جواب دیا۔ اچھا ٹیال صاحب اب تم بھی غیرت برتنے لگے اور آپ جانتی ہیں کہ یہ دونوں کرکٹ کے بہت بڑے کھلاڑی ہیں۔“
 شہناز ہنسنے لگی۔

”یہ آپ نے درخت میں کیا لٹکا رکھا ہے۔“ اس نے پوچھا۔
 ”ریت کا تھیلا ہے۔“

”رت کا تھیلا۔“ بڑی حیرت سے شہناز نے پوچھا۔ ”وہ کس لیے؟“
 ”جی ذرا باکسنگ کی پریکٹس کر رہا ہوں۔“
 ”کیس آپ نے مقابلوں میں نام تو نہیں دے دیا۔“ شہناز نے گھبرا کر پوچھا۔
 ”بات کچھ ایسی ہی ہے۔“ ٹکلیل نے دوسری طرف منہ پھیر کر جواب دیا۔
 ”آپ جانتے ہیں کہ قیصر بھی ان مقابلوں میں شریک ہو رہا ہے۔“
 ”یہ جاننے کے بعد ہی تو نام دیا ہے۔“
 ”وہ باکسنگ میں کالج کا چیمپئن ہے۔“ شہناز نے بدستور گھبرائے ہوئے انداز سے بولی۔

”جی ہاں یہ بھی جانتا ہوں۔“
 ”پھر..... پھر..... آپ نے نام کیوں دیا۔“
 ”مجھ صاحب اور مجیب صاحب نے اتنا اصرار کیا کہ میں انکار نہیں کر سکا۔“
 ”اوہ۔“ شہناز جیسے چونک سی گئی۔ کیا کرکٹ ٹیم میں بھی آپ نے ان ہی کے کہنے سے نام دیا تھا۔“
 ”جی ہاں! مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا۔“
 ”میں سمجھ گئی۔“ شہناز ٹکلیل کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھ اور مجیب دونوں قیصر کے دوست ہیں۔ انہوں نے قیصر ہی کے کہنے سے آپ کو اکسایا ہوگا اور اسی لیے جب آپ بیٹنگ کر رہے تھے تو وہ بمپر پھینک رہا تھا۔“
 ”بمپر پھینک رہا تھا۔“ ٹکلیل نے حیرت سے پوچھا۔ ”میں نے تو نہیں دیکھا۔“
 ”بمپر نہیں بمپر۔“
 ”تائنگے کا۔“

”بمپر ایک طرح کی بال ہوتی ہے جو اچھل کر کھیلنے والے کے سر کی جانب آتی ہے۔“
 شہناز نے بتایا۔ ”اس کا مقصد بیٹ مین کو پریشان کرنا ہوتا ہے۔“
 ”تو قیصر مجھے پریشان کرنا چاہتے تھے۔“ ٹکلیل نے سر ہلایا۔
 ”صرف پریشان کرنا ہی نہیں، وہ سمجھتا تھا کہ آپ کو کھیلنا نہیں آتا، اپنا بچاؤ نہیں

کر سکیں گے اور کوئی نہ کوئی گیند آپ کو خدا نخواستہ زخمی کر دے گی۔“

”مگر کیوں؟“ ٹھکیل نے پوچھا۔

شہناز خاموش ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”اور اب وہ اسی لیے آپ کو باکسنگ میں اپنے مقابلے پر لانا چاہتا ہے۔“ وہ کچھ دیر کے بعد بولی۔ ”تاکہ جو کام وہ کرکٹ کی گیند سے نہیں لے سکا اپنے گھونٹوں سے لے لے۔“

”مگر پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں؟ اسے مجھ سے ایسی کیا دشمنی ہے میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟“

”قیصر میرا خالہ زاد بھائی ہے۔“ شہناز نے بدستور دوسری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”صحیح یا غلط اسے خوش فہمی تھی کہ شاید میں اسے پسند کرتی ہوں میں ایک دو مرتبہ آپ کے ساتھ کافی پینے چلی گئی یا کبھی پارک اور لائبریری میں آپ کے ساتھ چند منٹ باتیں کر لیں تو وہ یہ سمجھا کہ شاید آپ نے اس کی جگہ حاصل کر لی ہے اور اسی لیے وہ یہ تمام باتیں آپ سے انتقام لینے کے لیے کر رہا ہے۔“

”تو کیا واقعی میں نے اس کی جگہ حاصل کر لی ہے۔“ ٹھکیل نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ شہناز آہستہ سے مسکرائی۔

”گویا، واعظ تنگ نظر نے..... مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں۔“

”آپ لوگ عورت کی توجہ کا صرف ایک ہی مطلب کیوں لیتے ہیں۔ شہناز نے جواب دیا مگر لہجہ میں کوئی تلخی نہیں تھی۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمارے تعلقات صرف خلوص اور ہمدردی کی بنا پر قائم ہو سکیں۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا ضرور ہو سکتا ہے۔“ ٹھکیل نے جواب دیا۔ ”خود ہمارے محلے میں شیخ صاحب نے اپنے گھر میں کیوٹر اور بیلی دونوں پال رکھے ہیں اور دونوں بڑے خلوص کے ساتھ رہتے ہیں۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ پھر آپ مجھے باکسنگ کے مقابلے میں شریک ہونے سے کیوں روک رہی ہیں۔“

”اس لیے کہ جو خلوص مجھے آپ سے ہے اس کی بنا پر میں نہیں چاہتی قیصر آپ کو کوئی

نقصان پہنچائے۔ شہناز نے جواب دیا۔

”آپ کے خلوص کا بہت بہت شکریہ مگر میں مقابلے کے لیے نام دے چکا ہوں۔ اور اب پیچھے قدم ہٹا کر کالج میں اپنی ہنسی اڑوانا نہیں چاہتا۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔

”مگر آپ کا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔“

”تو پھر کیا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ دو چار ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ ایک دو مہینے اسپتال میں رہنا پڑے گا۔“ ٹکیل نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔ مردوں کے لیے ان باتوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔“

شہناز نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ تیزی سے گھومی اور پارک سے باہر چلی گئی۔ اس کا رخ اسپورٹس ہال کی طرف تھا جہاں دوسرے کھیلوں کے ساتھ ساتھ باکسنگ کی مشق کرنے کا انتظام بھی تھا۔ قیصر ایک معمولی باکسر کے ساتھ مشق کر رہا تھا۔ شہناز کو دیکھا تو رک گیا۔

”یہ گھر نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”ہوتا تو غالب کا یہ شعر ضرور پڑھتا۔“ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت“

”جی ہاں! خدا کی قدرت کا قائل آج آپ سے زیادہ کون ہو گا۔“ شہناز نے جواب

دیا۔

”اگر یہ اشارہ کل کے میچ کی جانب ہے تو وہ خدا کی قدرت سے زیادہ حسن اتفاق کی بات ہے۔“ قیصر ہنسا۔ ”خدا کی قدرت دیکھنا ہے تو شام کے مقابلوں میں دیکھنا۔“

”میں اس سلسلے میں آپ سے علیحدگی میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“

”زہے نصیب۔“ قیصر نے کرسی کی پشت سے گاوٹ اٹھا کر پہن لیا۔

”تشریف لائیے۔“

دونوں باہر برآمدے میں آ گئے۔

”ٹکیل صاحب کو باکسنگ کے مقابلے کے لیے اپنا نام دینے پر آپ نے آمادہ کیا تھا۔“

شہناز نے فوراً مطلب پر آتے ہوئے کہا۔

”بالکل نہیں، میری ان جوکر صاحب سے تقریباً ایک ہفتے سے کوئی بات ہی نہیں

ہوئی۔“

”مگر تم نے امجد اور مجیب کو ان کے پیچھے ضرور لگا دیا ہے۔“

”میں دوستوں کو اپنی پسند اور ناپسند کا پابند تو نہیں بنا سکتا کہ وہ فلاں سے ملیں اور فلاں سے نہ ملیں۔“

”بہر حال مجھے معلوم ہے امجد اور مجیب نے آپ کے اشارے پر ٹھیکل صاحب یا کنگ کے مقابلے میں شریک ہونے کے لیے اکسایا ہے۔“

”فرض کرو یہی بات ہو تو پھر۔“

”میں نہیں چاہتی کہ آپ ایک اناڑی اور ناتجربے کار آدمی پر اپنی مہارت آزمائیں۔“ شہناز نے سخت لہجہ میں کہا۔ ”آپ کو کوشش کرنا ہوگی کہ ٹھیکل صاحب کا ہاتھ مقابلے سے خارج کر دیا جائے اور یہ ممکن نہ ہو سکے تو مقابلوں کا ڈرا اس انداز سے ہو کہ آپ کے مقابلے میں نہ آسکیں۔“

”بہت ہمدردی ہے اس جو کرے۔“ قیصر نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

”آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔“

”مگر مجھے افسوس ہے کہ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”مقابلوں میں تعین کیا جا چکا ہے اور تمہیں سن کر خوشی ہوگی کہ میرا پہلا مقابلہ ٹھیکل صاحب سے ہے۔“

”میری رائے آپ کے بارے میں پہلے بھی کوئی اچھی نہیں تھی۔“ شہناز نے بے انتہائی نفرت سے کہا۔ ”مگر مجھے امید نہیں تھی کہ آپ ایسی اوجھی حرکتوں پر اتر آئیں گے۔“

”محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔“

”محبت کا تو نام بھی مت لیجئے مسٹر قیصر۔ اب تو صرف جنگ ہی جنگ باقی رہ گئی ہے۔ شہناز نے تیزی سے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

باکسنگ کے مقابلوں میں صرف چار جوڑوں کا اعلان کیا گیا تھا۔ ان مقابلوں میں کامیاب ہونے والے چار باکسروں سے دو جوڑے بنائے گئے تھے اور فائنل مقابلہ ان کے جیتنے والوں کے درمیان ہونا تھا۔ مقابلے شام کے چھ بجے سے شروع ہوئے۔ پہلا مقابلہ قیصر اور کلیل کے درمیان ہونا تھا مگر پھر اسے آخر میں رکھ دیا گیا۔ یہ بھی قیصر کی شرارت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لڑکے اس کے ہاتھوں کلیل کی درگت بنتے دیکھیں اور واقعی جب آخری مقابلے کا اعلان کیا گیا تو رنگ کے چاروں طرف دیکھنے والوں کی تعداد تین چار ہزار سے بھی تجاوز کر چکی تھی۔ دوسرے کالجوں کے بہت سے طلباء بھی ان دلچسپ مقابلوں کو دیکھنے آ گئے تھے۔

شہناز، پروین کے ساتھ اگلی صف میں موجود تھی۔ جس وقت کلیل سبز گاؤن پہنے باکسنگ ڈریس میں رنگ میں اترا تو ایک مرتبہ تو اس کی پلکیں بھی جھپک گئیں۔ اسے ہی کیا قیصر کو بھی یہ امید نہیں تھی کہ ڈھیلے ڈھالے بدنما سوٹ میں جو جسم چھپا ہوا تھا وہ اتنا مناسب، اتنا سڈول اور اتنا خوبصورت ہو گا۔ چوڑا چکلا سینہ، چیتے کی سی کمر، بھرے بھرے بازو، ابھرے ہوئے عضلات بالکل جیسے کسی یونانی دیوتا کا تراشا ہوا سنگ مرمر کا مجسمہ۔

قیصر کا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں اس نے کلیل کو سمجھنے میں غلطی تو نہیں کی ہے۔ دوسری طرف شہناز کو قدرے اطمینان سا ہوا، اگر یہ خوبصورت جسم محض نمائشی نہیں تو قیصر کو اتنیوں پسینہ آجائے گا۔ مگر ایک خاص بات جس نے قیصر کو ہمت دلائی وہ یہ تھی کہ کلیل نے آج چشمہ نہیں لگایا تھا اور چشمہ لگانے کا عادی چشمے کے بغیر اندھا ہی ہوتا ہے۔ ہاتھ ٹھاکر تالیوں کا جواب دیتے ہوئے کلیل جب شہناز کی طرف گھوما تو چشمے کے بغیر اس کا چہرہ شہناز کو ہمیشہ سے زیادہ اچھا معلوم ہوا۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس چہرے کو پہلے ہی کہیں دیکھ چکی ہے۔

کالج کے باکسنگ کوچ نے جو ریفری کے فرائض انجام دے رہا تھا، دونوں کے ہاتھ ایک

دوسرے سے ملوائے اور مقابلے کے خاص خاص قواعد بتائے۔ فوراً ہی پہلے راؤنڈ کی کھینچ گئی۔ ابھی گھنٹی کی آواز ہوا میں مرتش ہی تھی کہ قیصر نے چمک کر ایک ہاتھ چلایا۔ کھینچ کو اتنی پھرتی کی شاید خواب میں بھی توقع نہیں تھی۔ مکمل بے خبری میں قیصر کا گھونسا کے بائیں جبرے پر پڑا اور وہ جھومتا ہوا گھٹنوں کے بل نیچے گر گیا۔ شہناز کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ قیصر نے آگے بڑھ کر ایک اور مکا جڑ دیا اور کھلیل اوندھے نیچے گر پڑا۔ ریفری نے گنتی گننا شروع کر دی مگر پانچ تک ہی پہنچا تھا کہ کھلیل اٹھ کھڑا ہوا۔ قیصر نے آگے بڑھ کر ایک پانچ مارا جسے کھلیل نے ہاتھوں پر روک لیا۔ اب صورہ تھی کہ قیصر بڑھ بڑھ کر ہاتھ لگا رہا تھا اور کھلیل دونوں ہاتھ اوپر کیے رنگ کے کونوں میں پھر رہا تھا۔ دیکھنے والے محسوس کر رہے تھے کہ وہ محض اپنی نا تجربے کاری کی وجہ سے رہا تھا۔ شہناز دم بہ دم سفید پڑتے ہوئے چہرے کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ختم ہونے کی گھنٹی بجی تو کھلیل کے بارے میں تو معلوم نہیں مگر شہناز نے اس طرح اس کی سانس لی تھی جیسے مقابلہ ختم ہو گیا ہو اور اس کے بعد کوئی اور راؤنڈ نہیں ہوتا ہے۔ کرکٹ کا میچ جیتنے کے بعد سے رشید ایک طرح کھلیل کا ہمدرد بن گیا تھا۔ رنگ گوشے میں وہی اس وقت کھلیل کی مدد کے لیے موجود تھا۔

راؤنڈ ختم ہوتے ہی وہ تولیہ اور پانی کا جگ لے کر اس کی طرف بڑھا۔
 ”یار یہ قیصر تو گھونے مار مار کر میرا بھر کس نکال دے گا۔“ کھلیل نے گلاس میں لے کر کچھ پیتے اور باقی کلیاں کرتے ہوئے کہا۔
 ”کیا یہ مقابلہ برابر نہیں چھڑوایا جاسکتا۔“

”یہ بات تو آپ کو قیصر کے مقابلے میں آنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔“ رشید ہمدردی سے کہا۔ ”ویسے میرا مشورہ اگر آپ مانیں تو دوسرے راؤنڈ میں کوئی ہلکا ہاتھ کھانے کے بعد آپ گر جائیں اور دس کی گنتی پوری ہو جانے دیں۔ ہارنا تو آپ کو ہے مگر اس طرح زیادہ مار کھانے سے بچ جائیں گے۔“
 دوسری طرف قیصر مجب سے کہہ رہا تھا۔

”اگر وہ نا تجربے کا رنہ ہوتا تو آج کالج میں میری ٹاک کئے بغیر نہیں رہتی۔ میں نے اس کے ایسے ہاتھ مارے ہیں کہ دوسرا کوئی ہوتا تو لمبا لمبا لیٹ گیا ہوتا۔“
 ”دوسرا راونڈ شروع ہوا مگر ٹھیکل کرسی پر ہی بیٹھا رہا۔
 ”جاتے کیوں نہیں۔“ رشید نے دبے ہوئے لہجہ میں کہا۔
 ”چلے جائیں گے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“ ٹھیکل نے جواب دیا۔
 ”مگر تھکنی بیج چکی ہے۔“

”اچھا بھئی اچھا۔“ ٹھیکل نے قیصر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر جیسے بہ مجبوری کہا۔ وہ ڈراما اٹھا اور رشید نے کرسی کھینچ لی جس کی وجہ سے ٹھیکل اسی پوزیشن میں نیچے گر گیا۔
 قیصر کا سیدھا ہاتھ چل چکا تھا۔ ٹھیکل گرا تو نشانہ خطا تو ہونا ہی تھا۔ قیصر کا مکا اس کے سر سے ایک فٹ اوپر سے گزرتا ہوا رنگ کی رسیوں سے الجھ گیا۔ اسی وقت غالباً قیصر کو اپنے سر پر سوار دیکھ کر ٹھیکل گھبرا کر اٹھا بالکل اسی طرح جیسے کوئی دروازے پر لٹکے ہوئے پردے کو ہٹانے کے بجائے اٹھا کر کسی کمرے میں داخل ہوتا ہے اور نتیجہ اس کے اٹھنے کا یہ ہوا کہ قیصر ایک اعلیٰ درجے کی فلا بازی کھاتا ہوا رنگ کے باہر جاگرا۔ پہلے تو کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا لیکن جب سمجھ میں آیا تو لوگ بے تحاشا قہقہے لگانے لگے کیونکہ ٹھیکل اکیلا رنگ میں کھڑا ہوا بڑی حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔
 ”یہ قیصر صاحب کہاں گئے۔“ اس نے رفیری سے پوچھ بھی لیا۔ اور لوگوں کے قہقہے کچھ اور تیز ہو گئے۔

”ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔“ رفیری گن رہا تھا۔
 قیصر بڑی مشکل سے دوبارہ رنگ میں داخل ہوا۔ اسے بے حد تاؤ آ رہا تھا۔
 ”ارے بھئی کہاں چلے گئے تھے۔“ ٹھیکل نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔
 اور جواب میں قیصر نے اس پر گھونسوں کی بوچھاڑ کر دی۔
 ”ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ ارے۔۔۔“ ٹھیکل ایک ہاتھ سے منہ اور پیٹ پر پڑنے والے گھونسوں کو روکتے ہوئے پیچھے ہٹا چلا گیا۔ ”کمال ہے خیریت ہی تو پوچھی تھی

کوئی گالی تو نہیں دی تھی۔“

ٹکلیل ہٹے ہٹے رسیوں سے لگ گیا تھا۔

”ہاں استاد ایک مرتبہ پھر وہی داؤ ہو جائے۔“ مجمع میں سے کسی نے چلا کر کہا۔ قیصر نے دباۓ چلا جا رہا تھا یہ آواز سنتے ہی چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ صرف ایک ٹانے کے لیے اس کے ہاتھ بھی رک گئے۔“

”ڈر گئے۔“ ٹکلیل زیر لب بولا۔ ”آؤنا مارتے کیوں نہیں؟“

قیصر نے جھنجھلا کر ہاتھ چلایا۔ ٹکلیل جلدی سے نیچے جھک گیا۔ پوری طاقت سے مارا ہوا گھونسا رنگ کے آہنی پول سے ٹکرایا۔ قیصر کا ہاتھ جھنجھنا کر رہ گیا۔ ٹکلیل نے کمال پھرتی سے اس کے پیچھے پہنچ کر ایک چپت جھاڑ دی۔

”اس بے چارے کعبے کو کیوں مارتے ہو۔“ وہ بولا۔

قیصر منہ ہی منہ میں گالی دیتا ہوا پلٹا۔ جھلا کر گھونسا چلایا مگر ٹکلیل وہاں کہاں تھا۔ وہ تو ایک جست میں پھر اس کے پیچھے پہنچ چکا تھا اور پھر قیصر کو ایک زودار چپت برداشت کرنا پڑی۔ دیکھنے والوں نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ شہناز کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ اب یہ ہو رہا تھا کہ قیصر ایک طرف گھومتا تو ٹکلیل دوسری طرف سے اس کے ایک چپت لگا دیتا۔ ”یہ ٹکلیل صاحب کیا تماشا کر رہے ہیں۔“ شہناز نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

دو سرار اوٹنڈ بھی ختم ہوا تو چپتیں کھا کھا کر قیصر کا سر بھنا گیا تھا۔

”یہ کوئی باکسنگ کا طریقہ نہیں ہے۔“ اس نے ریفری سے شکایت کی۔ ”آپ اس سے کہیں کہ وہ سامنے آکر مقابلہ کرے یہ کیا مسخروں کی طرح اچھل کود لگا رکھی ہے۔“

”مجھے کوئی ایسا اصول یاد نہیں آ رہا ہے جس کی رو سے سر کے اوپر مکا مارنا خلاف قاعدہ قرار دیا گیا ہو۔“ ریفری نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر وہ مکا نہیں چپت مار رہا ہے۔“ قیصر نے منہ بسورا۔

گھنٹی بجی قیصر اور ٹکلیل آمنے سامنے آئے۔

”تم باکسنگ کا مقابلہ کر رہے ہو یا نٹ بازی کا۔“ قیصر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”اے اردو میں چاکنگ عرف چپت بازی کہتے ہیں۔“ ٹکیل نے اچھل کر ایک چپت مارتے ہوئے جواب دیا۔

قیصر نے دانت پیٹتے ہوئے لینٹ ہک مارنے کی کوشش کی۔ ٹکیل جلدی سے نیچے جھک گیا اور جھکنے کے ساتھ ہی اس کے پیٹ پر ایک ہاتھ مارا۔ آواز آئی ”مم“ دیکھنے والے تو دیکھنے والے ریفری صاحب بھی اپنی جگہ اچھل پڑے۔ قیصر نے چونک کر اپنے پیٹ کی طرف دیکھا۔

”بھئی واہ۔“ ٹکیل بولا اور جلدی سے دو ہاتھ اور مار دیئے۔ ”مم مم۔“ قیصر بت بنا حیران سا کھڑا تھا۔ اسٹیڈیم کی فضا تمقوں سے گونج رہی تھی۔ لوگ ہنستے ہنستے دہرے ہوئے جا رہے تھے۔

ٹکیل نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک گھونسا ناک پر دیا۔ ”پوں پوں۔“ جیسے کسی کار کا ہارن بجا ہو قیصر نے گھبرا کر ناک ٹٹولی۔ ٹکیل نے ہاتھ پھیلائے اور اس کا سر درمیان میں لیتے ہوئے دونوں کانوں پر جیسے تالی بجا دی۔

”چھن چھن چھناک۔“ بحرے سے بول اٹھے۔
”واللہ آدمی ہو یا چلتا پھرتا بینڈ۔“ ٹکیل نے کہا اور ریفری کی طرف دیکھا۔ ”ریفری صاحب اب آپ مالکوس کا خیال تین تالوں میں سنئے۔“

”چھن چھن چھناک۔ پوں۔ مم۔ پوں۔ مم۔ مم۔ پوں چھن چھن۔ مم مم چھناک۔ پوں۔ مم۔ پوں۔ پوں۔ مم۔“

ٹکیل کے ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ قیصر نے ہر چند بچنے کی کوشش کی مگر ناک کان اور پیٹ پر کئے برستے ہی رہے۔ ناک پر تین چار ہاتھ متواتر لگے تو تکلیف سے قیصر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لوگوں کے قہقہے اور چیخے چگھاڑنے کا یہ حال تھا کہ راؤنڈ کی گھنٹی بجانے والا اپنا فرض بھی بھول بیٹھا تھا۔ ٹکیل نے پوری طاقت سے ایک ہاتھ قیصر کی کپٹی پر رسید کیا اور قیصر کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے نیچے گر گیا۔
”ایک دو تین چار پانچ چھ ساتھ آٹھ۔“ ریفری نے کنتی شروع کی۔ ”نودس۔“

بس ٹکیل نے خود ہی اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

اور مقابلے کے ناظرین نے تالیوں کے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اسی شور میں ریفری نے ٹکیل کے جیتنے کا اعلان کیا۔ اعلان ختم ہوا تو ٹکیل نے آگے بڑھ کر ریفری کے ہاتھ سے مانگ لے لیا۔

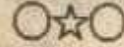
”پیارے بھائیو! اور معزز طالبات۔“ اس نے کہا۔ ”میں معذرت خواہ ہوں کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے اور جملہ خواتین کو عزیز بہنوں میں شمار کر کے اپنے امکانات ختم کرنا نہیں چاہتا۔ (تالیاں) ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ابھی آپ نے جو چیز ملاحظہ کی وہ علم موسیقی کی رو سے باکسنگ کا خیال دو باکسروں میں تھا۔ جس میں ریفری صاحب سیٹی پر سنگت کر رہے تھے۔ ہر چند کہ میں قیصر صاحب کو باکس خیال نہیں کرتا اور یقیناً آپ نے بھی آج تک کسی باکسر کے جسم کو اتنا سریلا نہیں پایا ہو گا۔ آج کل کالج کالج کا فیسٹیول ویک منایا جا رہا ہے اور چونکہ اس فیسٹیول کا ایک پروگرام گھونے بازی بھی ہوتا ہے اس لیے آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ منتظمین حضرات کا دل رکھنے کے لیے اس میوزیکل آئٹم کو باکسنگ کا پہلا مقابلہ ہی سمجھیں۔ (تالیاں) میرا اس مقابلے میں شریک ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ محض قیصر صاحب کی محبت اور ان کے دوستوں کا خلوص تھا کہ جو مجھے اس رنگ میں گھسیٹ لایا۔ (تالیاں) ساتھ ہی بیٹیاں بھی) وہ اس خاکسار کے ہاتھوں اپنی مرمت کرانا چاہتے تھے اور کچھ اتنا خلوص تھا ان کی اس خواہش میں کہ مجھے انکار کرنے کا حوصلہ نہیں ہو سکا۔ (تالیاں) سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں جبکہ لوگ اپنی جیت کی خاطر گھیراؤ جلاؤ کی دھمکیاں دیتے ہیں قیصر صاحب کا یہ ایثار سونے بلکہ جاگنے کے الفاظ میں لکھنے کے قابل ہے۔ یقین کیجئے کہ اگر میں شاعر ہوتا تو ضرور ایک دو لوریاں لکھ کر آپ صاحبان کو سناتا۔ بہر حال مجھے امید ہے کہ قیصر صاحب کی یہ مثال اس ملک کے بہت سے باکسروں کی رہنمائی کرے گی اور وہ بھی اپنی تحلیل نفسی کے لئے اس نسخے پر عمل پیرا ہونے کی پوری کوشش کریں گے۔“

”بھائیو! میں نے صرف قیصر کی مرمت کے لیے ان مقابلوں میں اپنا نام دیا تھا۔ خدا کا

شکر ہے کہ قیصر صاحب میرے بعد کسی اور کے ہاتھ مار کھانا پسند نہیں کریں گے۔ اس لیے ان کا نام بھی خارج کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ ویسے یہ صرف ایک اندازہ ہی ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ خود اس بارے میں زیادہ بہتر فیصلہ کر سکیں گے۔“

”آخر میں آپ حضرات کو اپنا شکریہ ادا کرنے کی اجازت دیتا ہوں کہ میں آپ کے سامنے، قیصر صاحب کے تعاون سے، ایک بہترین سبق آموز پروگرام پیش کر سکا۔ امید ہے آپ لوگ صرف شکریہ ادا کر کے نہیں بلکہ مبارک باد دیں گے جو تحفے تحائف کی صورت میں زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے۔ آپ میری تقریر سے یقیناً لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ اس لیے میں مزید آپ کی سامع نوازی نہیں کرنا چاہتا۔ فیسٹیول ویک کمیٹی کے سیکریٹری صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میرے نام آئی ہوئی جملہ مبارک باد بڑی ایمانداری سے مجھ تک پہنچا دیں گے اس لیے آپ اپنے تحائف بلا جھجک ان کے پاس جمع کر سکتے ہیں۔ خدا حافظ۔“

شکیل خاموش ہوا تو تالیوں کے بے پناہ شور سے پورے کالج کی فضا گونج رہی تھی۔ اس ہنگامے میں کب، چپ چاپ امجد اور عجیب قیصر کو اٹھا کر لے گئے پتا ہی نہیں چل سکا۔



ٹکیل لائبریری کے اسٹڈی روم میں بیٹھا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ شہناز پروین کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ دروازہ کھلتے بند ہونے کی آواز بھی ہوئی اور قدموں کی آہٹ بھی مگر ٹکیل نے نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔

”اللہ رے بے نیازی اب تو مارے غرور کے دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے۔“

پروین نے کہا۔

ٹکیل بدستور کتاب کے مطالعے میں محو رہا۔

”میں نے کہا حضور میں کچھ آپ ہی سے عرض کر رہی ہوں۔“ پروین پھر بولی۔ ٹکیل

صاحب۔ ”شہناز نے اس کے داہنی جانب دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اوہ۔ آپ لوگ مجھ سے مخاطب ہیں۔“ ٹکیل نے کتاب سے نظریں اٹھائے بغیر

جواب دیا۔ ”میں سمجھا تھا آپس میں گفتگو کر رہی ہیں۔“

”خوب گویا آپ ہماری آمد سے بے خبر نہیں تھے۔ محض بننے کی کوشش کر رہے

ہیں۔“ پروین اٹنے ہاتھ کی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔ ”آپ تو اپنا پروپگنڈا خود

کرتی ہوئی چلتی ہیں۔“

”کیا مطلب۔“ شہناز نے پوچھا۔

”دروازہ کھلتے ہی ہوا کے ایک معطر جھونکے نے آپ کی آمد کا اعلان کر دیا تھا۔“

ٹکیل نے جواب دیا۔

”آپ کی ناک بڑی خطرناک معلوم ہوتی ہے۔“ شہناز مسکرائی۔

”صرف ناک ہی نہیں مجھے تو ٹکیل صاحب بھی بڑے خطرناک محسوس ہوتے ہیں۔“

پروین نے کہا۔ ”کوئی صورت دیکھے تو سمجھے گا کہ بے چارے بہت بھولے بھالے سیدھے

سادھے آدمی ہیں مگر قیصر جیسے تجربے کار باکسر کو انہوں نے جس طرح مذاق ہی مذاق میں

ناک آؤٹ کر دیا اسے دیکھ کر تو یہی کہا جاسکتا ہے ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔“
 ”نی الحال تو مجھے آپ کی جانب سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔“ کلیل بولا۔ دائیں
 بائیں اس طرح گھیر کر بیٹھی ہیں جیسے میں کوئی زیر حراست قیدی ہوں۔“
 ”قیدی تو خیر نہیں مگر زیر حراست ضرور ہیں۔“ پروین نے جواب دیا۔
 ”وہ کس جرم میں؟“

”باکسنگ کے مقابلے کے بعد ہم لوگ آپ کو تلاش ہی کرتے رہے۔“ شہناز نے
 بتایا۔ ”مگر آپ ایسے غائب ہوئے کہ آج پورے چار دن بعد نظر آئے ہیں۔ یہ جرم نہیں تو
 اور کیا ہے۔“

”مگر آپ مجھے کیوں تلاش کر رہی تھیں۔“
 ”مبارک بادوینے کے لیے۔“ پروین نے کہا۔
 ”تو اس کے لیے میری کیا ضرورت تھی۔ آپ سیکریٹری صاحب کے پاس جمع
 کرا دیتیں۔“

”کیا چیز؟“ شہناز نے کچھ تعجب سے پوچھا۔
 ”وہ تحفے جو آپ..... میرا مطلب ہے اپنی مبارک باد۔ میں نے مقابلے کے بعد اپنی
 تقریر میں سب کچھ تو بتا دیا تھا۔“

”اوہ! شہناز ہنسنے لگی۔ ”مگر بہت سی باتیں اب بھی دریافت طلب ہیں۔“
 ”جی ہاں۔“ پروین نے کہا۔ ”مثلاً مقابلے کے بعد کچھ لوگوں نے ہر چند قیصر کو ٹھوک
 بجا کر دیکھا مگر وہ جلت رنگ جو آپ سنا گئے تھے پھر سننے کو نہیں ملا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟“
 ”اس کی وجہ تو قیصر صاحب ہی بتا سکیں گے۔“ کلیل نے سادگی سے جواب دیا۔
 ”آپ کہتی ہیں کہ وہ جلت رنگ دوبارہ سنائی نہیں دیا۔ ممکن ہے قیصر صاحب نے خود ہی والیوم
 آف کر رکھا ہو یا پھر کوئی اور اندرونی ٹیکنیکل خرابی ہو گئی ہو۔“
 شہناز نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”اچھا یہ بتائیے کہ آپ اتنے دن کلج کیوں نہیں آئے؟“

”میں نے سوچا قیصر صاحب ٹھہرے چیمپئن باکسر۔ اس رات انہوں نے خدا جانے کس موڈ میں مجھ سے اپنی مرمت کرائی۔ ممکن ہے یار دوستوں کی باتیں سن سن کر انہیں تاؤ آگیا ہو اور اب اس فکر میں ہوں کہ کہیں میں نظر آجاؤں تو حساب کتاب برابر کر لیں۔“

”گویا آپ قیصر صاحب سے ڈرتے ہیں۔“ پروین بولی۔
”نہیں خیر ڈرتا تو نہیں ہوں مگر دیکھیے نا خواہ مخواہ ہاتھ پیر تڑوانے سے فائدہ بھی کیا۔“

”یہ چشمہ آپ کیوں لگاتے ہیں۔“ شہناز نے اچانک پوچھا۔
”یہ کیا سوال ہوا۔“ ثکیل نے کہا۔ ”پھر آپ یہ پوچھیں گی کہ کھانا کیوں کھاتے ہیں۔“

”آپ کا مطلب ہے چشمہ آپ کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح کھانا۔“
”جی ہاں۔ بالکل۔“

”آپ کی نظر کمزور ہے؟“

”جی نہیں دل کمزور ہے۔“

”دل کی کمزوری کا چشمہ سے کیا تعلق؟“ پروین نے تعجب سے پوچھا۔
”بہت بڑا تعلق ہے محترمہ۔“ ثکیل نے جواب دیا۔ ”یہ تو آپ مانیں گی کہ انسان جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہی اس کے اچھے یا برے اثرات دل پر ضرور پڑتے ہیں۔ ایک اچھا منظر اگر دل کو پشاش کر سکتا ہے تو ایک خوفناک منظر کے اثرات دل کو دہشت زدہ بھی کر دیا کرتے ہیں۔ بد قسمتی سے میرا دل اس معاملے میں بڑا نازک ہے کہ وہ کسی اچھی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر محبت کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ آپ یقین نہ کریں گی مگر میں پچھلا کالج چھوڑنے پر اسی لیے مجبور ہو گیا کہ وہاں میری کلاس میں پندرہ لڑکیاں تھیں اور سب کی سب اتنی حسین تھیں کہ میں بہ یک وقت ان سب کی محبت میں گرفتار ہو چکا۔ تھا آج کل جب کہ کسی نوجوان کو پاگل کرنے کے لیے ایک لڑکی سے محبت کرنا کافی ہوتا ہے“

آپ بخوبی اندازہ لگا سکتی ہیں کہ پندرہ پندرہ محبتوں نے میرا کیا حال کیا ہوگا۔ آخر جب زندگی کے لالے پڑ گئے تو والد صاحب نے ایک مرد کامل جو کہ عامل بے عمل تھے، میری کیفیت بتائی۔ اس مرد عاقل و دانا تندرست و توانا نے اپنی جھولی سے یہ چشمہ نکالا اور اس پر کوئی تیر ہدف عمل دم کر کے میری آنکھوں پر لگا دیا۔

دوسرے دن میں نے کالج جا کر جب ان لڑکیوں کو دیکھا تو ایک سے ایک اعلیٰ معیار کی چیزیں دکھائی دیں۔ محبت کا نشہ اسی وقت ہرن بلکہ بارہ سنگھا ہو گیا۔ اتنا سما کہ اسی دن کالج سے نام کٹا لیا۔ دوسرے دن وہ شہر بھی چھوڑ دیا۔ تیسرے دن ملک چھوڑنے کے ارادے سے انرپورٹ جا رہا تھا کہ اچانک ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ چھوڑنے کی یہی رفتار رہی تو کل دنیا چھوڑنے کا نمبر بھی آسکتا ہے۔ میں نے لا حول پڑھی اور انرپورٹ کے بجائے ریلوے اسٹیشن جا پہنچا۔ جو ٹرین سامنے نظر آئی اسی میں سوار ہو گیا۔ دوسرے روز اپنے آپ کو اس شہر میں پایا اور خدا کا شکر ہے کہ اس چشمے کی بدولت اب تک محبت کا کوئی اور دورہ نہیں پڑا۔“

شہناز اور پروین بڑی حیرت سے ٹھیکل کو دیکھ رہی تھیں۔ باتیں ایسی تھیں جن پر ہرگز یقین نہیں کیا جاسکتا تھا مگر ٹھیکل کا لہجہ اتنا سنجیدہ تھا کہ انہیں جھوٹ کہنے کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی تھی۔

”اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے قیصر صاحب سے مقابلہ کرتے وقت چشمہ اتار دیا تھا۔“ ٹھیکل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”وجہ یہی تھی کہ اول تو یہ چشمہ نظر کا نہیں ہے اور میں اس کے بغیر بھی بخوبی دیکھ سکتا ہوں، دوسرے وہ کوئی لڑکی نہیں تھی جن کی محبت میں مبتلا ہو جانے کا مجھے خطرہ ہوتا۔“

”آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔“ آخر شہناز الجھ کر بولی۔

”ایک منٹ۔“ پروین نے جلدی سے کہا۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ٹھیکل صاحب

اس چشمے سے آپ کو ہر فرد کی صورت بڑی خوفناک دکھائی دیتی ہوگی۔“

”ہر فرد کی نہیں صرف حسین لڑکیوں کی۔“ ٹھیکل نے جواب دیا۔ ”ورنہ عام صورتیں

جیسی ہوتی ہیں ویسی ہی نظر آتی ہیں۔“

”اچھا ذرا اتار دے تو سہی۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”اس چشمے کی یہ خصوصیت صرف میری آنکھوں کے لیے ہے۔ دوسرے کو اس میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آئے گی۔“

”میں سمجھتی ہوں کلیل صاحب ہمیں بتا رہے ہیں۔“ شہناز نے کہا۔

”کیا بتا رہا ہوں؟“ کلیل نے شہناز کی طرف دیکھا مگر شہناز بات ٹال گئی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”یہ تو بتائیے ہم دونوں آپ کو کیسے نظر آ رہے ہیں۔“ پروین نے شرارت سے پوچھا۔

”یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔“ کلیل مسکرایا۔

”رہنے دیجئے ہم پوچھنا بھی نہیں چاہتے۔“ شہناز کھڑی ہو گئی۔

”آؤ پروین چلیں۔“

”ارے مگر ابھی ہم نے کلیل صاحب کو پکچر دیکھنے کی دعوت تو دی ہی نہیں۔“ پروین نے کہا۔

”میرا خیال ہے کلیل صاحب کو پکچر دیکھنے کا کوئی خاص شوق نہیں ہوگا۔“ شہناز نے جواب دیا۔

”جی نہیں اس کے برعکس میرا ایک ہی شوق ہے پکچر دیکھنا۔“ کلیل جلدی سے بولا۔

”مگر آپ کو تو فلم ایکٹریس بھی اس چشمے سے چڑھیں نظر آتی ہوں گی۔“

”یہ ہی تو کمال ہے اس چشمے میں کہ تمام بے جان چیزیں اس کے دائرہ اثر سے خارج ہیں۔“

”پھر بھی آپ پڑھ رہے ہیں آپ کا وقت خراب ہوگا۔“ شہناز بولی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ پروین نے حیرت سے کہا۔ ”یا تو کہہ رہی تھیں کہ اگر کلیل صاحب نہیں گئے تو میں بھی نہیں جاؤں گی اور یا اب ایسی باتیں کر رہی ہو کہ وہ جاتے ہوں بھی تو نہ جائیں۔“

”خانا آپ نے غلط سنا۔“ فکیل نے جواب دیا۔ ”شہناز صاحبہ نے کہا تھا کہ اگر فکیل صاحب گئے تو میں نہیں جاؤں گی۔“

”بات یہ ہے فکیل صاحب کہ میرے بھائی جان اپنے دوستوں کے ساتھ فلم جانے کے لیے تین ٹکٹ لائے تھے۔“ پروین نے بتایا۔ ”مگر ان کا کوئی دوسرا پروگرام بن گیا تو انہوں نے ٹکٹ مجھے دے دیئے کہ اپنی سیلیوں کے ساتھ بکچر دیکھ آؤ۔ سچی بات ہے مجھے آپ کا خیال تک نہیں تھا۔ میں شہناز اور مریم جبین کو لے جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شہناز سے ذکر کیا تو انہوں نے خود ہی کہا کہ آپ کو کیوں نہ ساتھ لے لیا جائے۔“

”درست ہے مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب میں نے اپنی پندرہ فرضی محبوباؤں کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔“ فکیل نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”اب یہ سوچ رہی ہیں کہ بھی یہ تو بڑا ہرجائی نکلا۔ کیا پتا کب چشمہ اتار کر مجھے دیکھنے لگے۔“

شہناز کا منہ بن گیا۔ پروین نے ایک شریر قہقہہ لگایا۔

”بات تو آپ کی سمجھ میں آتی ہے۔“ وہ شہناز کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مگر ابھی آپ نے کہا فرضی محبوباؤں۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ وہ جو کچھ آپ نے بتایا تھا جھوٹ تھا۔“

فکیل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”آپ نے ایک ایسی بات پوچھی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مگر میں جواب میں سچ بول دیتا تو آپ دونوں میرا مذاق اڑاتیں۔ ریڈی میڈ ہمانہ تیار نہیں تھا۔ مجبوراً جلدی میں جیسا کچھ سمجھ میں آیا پیش کر دیا۔“

شہناز بڑے غور سے فکیل کو دیکھ رہی تھی۔

”جب آپ یہاں تک سچ بول گئے ہیں تو اب باقی بات بھی بتادیں۔“ پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کا بالکل مذاق نہیں اڑائیں گے۔“

”وہ تو اب بتانا ہی پڑے گی۔“ فکیل نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”میں شہناز صاحبہ کی بدگمانی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”کیوں جناب شہناز صاحبہ کی بدگمانی سے آپ کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔“ پروین

شوخی سے بولی۔ شہناز بدستور خاموش رہی۔

”یوں تو آپ نے بالکل ویسا ہی سوال کیا جیسا عموماً جغرافیہ کے پرچہ میں آتا ہے کہ پہاڑی مقامات کی آب و ہوا کا میدانی علاقے کے باشندوں کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ نقشہ بنا کر سمجھاؤ۔“ ٹکیل نے کہا۔ ”آخر آپ ایسی پرائیوٹ باتیں کیوں پوچھ رہی ہیں۔“

”اچھا چلے پہلی بات ہی بتادیں۔“ پروین نے کہا۔

”دراصل مجھ سے کسی نے کہا تھا کہ اگر میں چشمہ لگاؤں گا تو زیادہ خوبصورت اور زیادہ قابل نظر آؤں گا۔“ ٹکیل نے کچھ شرماتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اور آپ نے اس کے کہنے پر یقین کر لیا۔“ شہناز کو بھی ہنسی آگئی۔ ”غالباً یہ بے ڈھنگا سوٹ بھی اسی کے کہنے سے سلوایا ہو گا۔“

”جی ہاں!“ ٹکیل نے کچھ اور زیادہ شرماتے ہوئے بتایا۔

”مگر وہ تھا کون جس نے آپ کو یہ احمقانہ مشورہ دیا۔“ پروین نے پوچھا۔

”ایک دوست تھے جو پیرس، نیویارک اور لندن سے ماہر حسن و ملبوسات کی ڈبری لے کر آئے تھے اور آج کل رشد آباد میں بہت بڑا ہیرکننگ سیلون چلا رہے ہیں۔“

”ڈبری۔“ شہناز نے چونک کر پوچھا۔ ”آپ کا مطلب ڈگری سے تو نہیں۔“

”جی نہیں! میں نے بھی ان سے یہ سوال پوچھا تھا۔“ ٹکیل نے بتایا۔ ”انہوں نے جواب دیا کہ فرانس اور امریکا والے ان چیزوں میں ڈگری نہیں دیتے۔ بس ڈبری ٹائٹ کر دیتے ہیں۔“

پروین اور شہناز دونوں نے بے اختیار ایک قہقہہ لگایا۔

”بہر حال۔“ شہناز نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اگر کچھ پروگرام بتاؤ آپ کو ان کپڑوں میں جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔“

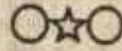
”مگر میرے پاس تو سارے سوٹ اسی اسٹائل کے ہیں۔“

”اس کا بھی کوئی حل سوچ لیا جائے گا۔“ شہناز نے جواب دیا۔ ”پہلے تو آپ میرے ساتھ گھر چلے۔“

”جی۔“ ٹکیل گھبرایا۔ ”مگر میں تو ایک ہو نل میں رہتا ہوں۔“
 ”میرا مطلب آپ کے گھر سے نہیں اپنے گھر سے تھا۔ میری امی آپ سے ملنا چاہتی
 ہیں۔“

”کیوں؟“ ٹکیل نے کچھ اور گھبراتے ہوئے پوچھا۔
 ”آج کل وہ قیصر بھائی سے بہت ناراض ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ نے باکسنگ
 میں قیصر بھائی کا بھرتا بتا دیا ہے تو کہنے لگیں کہ کسی دن لے کر آؤ اس بہادر لڑکے کو دیکھنا
 چاہتی ہوں۔“

”تو آج پکچر کا پروگرام کینسل۔“ ٹکیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 ”جی نہیں۔ ٹکٹ سیکنڈ شو کے ہیں۔“ پروین نے جواب دیا۔ ”شہناز کے گھر ہو کر پکچر
 باؤس چلیں گے۔“



شہناز ٹکیل اور پروین کو لے کر گھر پہنچی تو وہاں قیصر بھی موجود تھا۔
 ”خالہ جان اب میں کیا کروں اگر آپ کا چشمہ میری جیب سے نکل کر کہیں گر گیا۔“
 وہ بڑے ناگوار لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

”گر گیا تو کوئی بات نہیں تھی۔“ بیگم شاکر نے جواب دیا۔ ”سوال یہ ہے کہ تم اتنے دن مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے رہے۔ تمہیں معلوم ہے مجھے جھوٹ سے بے انتہا نفرت ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ باجی نے تمہاری تربیت اچھے ڈھنگ سے نہیں کی۔“

”افوہ! خالہ جان آپ تو ذرا اسی بات کو اہمیت دینے لگتی ہیں اور وہ بھی صرف میرے معاملے میں۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا کہ آج کل شہناز ایک احمق لڑکے ٹکیل کے ساتھ بہت گھومنے پھرنے لگی ہے مگر اتنی اہم بات کو آپ نے معمولی سمجھ کر بالکل نظر انداز کر دیا۔“

”تو آپ اس طرح میرے پیچھے امی سے میری برائیاں کرتے رہتے ہیں۔“ شہناز نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”ارے شہناز تم۔“ قیصر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آج بڑی جلدی کالج سے آگئیں۔“

”بات کو ٹال لے نہیں، جواب دیجئے۔“

”میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔ کیا تم ٹکیل کے ساتھ گھنٹوں لائبریری یا پارک میں بیٹھی باتیں نہیں کرتی رہتی ہو۔“
 ”تو یہ گھومنا پھرنا ہو گیا۔“

”تم تو سمجھتی نہیں ہو۔“ پروین نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”کلاس سے پارک تک بھی اگر تم ٹکیل صاحب کے ساتھ گئیں تو اس پر قطعی گھومنے پھرنے کے الفاظ صادق آسکتے ہیں۔“

”ارے بیٹی تم بھی کس کی باتوں کا برا مان رہی ہو۔“ بیگم شاکر نے شہناز سے کہا۔
میں کیا اپنے پیارے بھانجے کی عادتوں سے واقف نہیں ہوں۔ تم بتاؤ کہ ٹکیل کو کس دن
رہی ہو۔“

”جی۔“ قیصر چونکا۔ ”آپ نے اسے گھڑ لایا ہے۔“
”ہاں بھئی سنا تھا کہ اس نے باکنگ میں کسے مار مار کر تمہارا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔“ بیگم
شاکر مسکرائیں۔ ”میں نے سوچا کہ اسے گھڑ لاکر ذرا شکریہ ادا کروں۔“

”خالہ جان اس نے وہ مقابلہ چار سو بیسی سے جیتا تھا۔“ قیصر منہ بنا کر بولا۔ ”میں
سب معلوم کر چکا ہوں جس الیکٹرک کمپنی نے مقابلہ میں ٹیوب لائٹس اور لاؤڈ اسپیکر وغیرہ
فراہم کیا تھا اس کا ایک میکنک بھی ساتھ آیا تھا جو رنگ کے قرمبی ہی امپلی فائر کے پاس
بیٹھا تھا۔ ٹکیل نے اسے رشوت دے کر ملا لیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک ایسا ٹیپ ریکارڈر بھی
لے آیا تھا جس پر مختلف سازوں کی آوازوں کی ٹیپ تھیں۔“ ٹکیل کے اشارے پر اس نے
تیسرے راؤنڈ میں وہ ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ ان آوازوں سے میری توجہ مقابلے سے ہٹ گئی
اور ٹکیل نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا لیا۔

شہناز اور پروین ہی نہیں، بیگم شاکر بھی اس وضاحت پر قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکیں۔
”پھر کیا خیال ہے قیصر صاحب۔“ پروین بولی۔ ”ٹکیل صاحب سے دوبارہ مقابلہ کرا
دیا جائے۔ آپ آمادہ ہوں تو اس کا انتظام ابھی ہو سکتا ہے۔ وہ باہر ڈرائنگ روم میں بیٹھے
ہیں۔“

”کیا؟“ قیصر چونک کر کھڑا ہو گیا۔

”تم دونوں بھی پاگل ہی ہو۔ ادھر ادھر کی باتیں بتائی جا رہی ہو اور یہ نہیں بتایا کہ
ٹکیل کو ساتھ لائی ہو۔“ بیگم شاکر اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ پروین نے قیصر کی طرف دیکھا۔
”آپ بھی آئیے نا۔“ وہ بولی۔

”رہنے دو پروین۔“ شہناز نے جلدی سے کہا۔ ”اب یہ ٹکیل صاحب کے سامنے
جانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔“

”مجھے غصہ مت دلاؤ شہناز۔“ قیصر نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ ”کسی دن مزہ چکھاؤں گا تمہارے کلیل صاحب کو کہ تمام زندگی یاد رکھیں گے۔“ وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

”ارے آپ تو بچ جارہے ہیں۔“ شہناز نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو ڈر نہیں لگتا؟“

”میں تو ڈرائنگ روم میں آگے پیچھے داخل ہوئے۔“

”آہا قیصر صاحب۔“ کلیل بیگم شاکر سے باتیں کر رہا تھا۔ قیصر کو دیکھتے ہوئے اس سے کھڑا ہو گیا۔ ”آئیے تشریف لائیے۔“

”جی شکریہ۔ یہ میری خالہ کا گھر ہے یہاں اٹھنے بیٹھنے آنے جانے کے لیے مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے اور نہ حسین لڑکیوں کو بے وقوف بنانے کی۔“ قیصر ترش لہجہ میں جواب دیا۔

”معاف کیجئے گا۔ میں بھول گیا تھا کہ آپ پدرم سلطان بودکنے والوں میں سے ہیں۔“ کلیل نے سادگی سے کہا۔ شہناز قیصر کے الفاظ پر بگڑ کر کچھ کہنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ کلیل کا جواب سن کر ہنس پڑی۔ قیصر کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”چھا خالہ جان میں اب اجازت چاہوں گا۔“ وہ بیگم شاکر سے مخاطب ہوا۔ ”کیوں؟ آپ ہمارے ساتھ پکچر دیکھنے نہیں چل رہے ہیں؟“ کلیل نے جلدی سے پوچھا۔

”پکچر!“ قیصر نے حیرت سے شہناز اور پروین کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں پکچر۔“ شہناز نے جواب دیا۔ ”آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ قیصر نے فوراً کہا۔ ”کوئی پکچر دیکھنے جارہی ہو۔“

”ٹو سرودلو۔“ پروین نے جواب دیا۔

”فرسٹ شو؟“

”جی نہیں سیکنڈ۔“

قیصر نے سر ہلایا اور کچھ سوچتے ہوئے دروازے کی طرف چلا۔
 ”کیا عدنان صاحب بھی جا رہے ہیں۔“ اس نے پلٹ کر پوچھا۔
 ”آخر آپ کو اتنا تجسس کیوں ہے؟“ شہناز چڑ گئی۔ ”کوئی بھی جا رہا ہو آپ کی بلا
 آپ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ نہیں جا رہے ہیں۔“
 قیصر کوئی جواب دیے بغیر کمرے سے نکل گیا۔
 ”یہ عدنان صاحب کون ہیں؟“ فکیل نے پوچھا۔ بیگم شاکر اس کی طرف دیکھ کر
 ٹھٹھکانے لگیں۔

”یہ ایک اور بور صاحب ہیں۔“ شہناز نے منہ ہٹا کر جواب دیا۔
 ”عدنان صاحب کا نام تو کئی مرتبہ تمہارے منہ سے سنا مگر آج تک ان سے ملاقات
 میں ہوئی۔“ پروین بولی۔

”خدا کا شکر ادا کرو کہ نہیں ہوئی۔“ شہناز نے کہا۔ ”میں بھی اب تک صرف ایک
 مرتبہ ہی زیارت کر سکی ہوں اور بقول قصہ حاتم طائی بے تصویر کہ ایک بار دیکھا اور دوسری
 بار دیکھنے کی کوئی ہوس نہیں ہے۔ کم سے کم میں اس معاملے میں عدنان صاحب کو قیصر
 صاحب کے مقابلے میں زیادہ سمجھ دار مانتی ہوں کہ انہوں نے ایک دن بھی دخل در
 مقولات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ صبح ہوتے ہی گھر سے نکل جاتے ہیں اور پھر رات کو
 واپس آتے ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ پروین نے کچھ حیرت سے پوچھا۔ ”کیا جس دن سے آئے ہیں
 بارہ ملاقات نہیں ہوئی۔“
 ”بات یہ ہے بیٹی کہ وہ کسی بہت ضروری کام سے یہاں آیا ہے۔“ بیگم شاکر نے بتایا۔
 ”بس دن رات اسی میں لگا ہوا ہے۔“

”مگر پھر بھی ناشتے کی میز پر تو ملنا ہوتا ہی ہوگا۔“
 ”ناشتا وہ اپنے کمرے میں کر لیتا ہے۔“ بیگم شاکر نے جواب دیا۔
 ”میں نے سب کے ساتھ کرنے کے لیے کہا بھی تو بولا کہ کچھ لوگوں کی نظریں اتنی

خراب ہوتی ہیں کہ ان کے سامنے بیٹھ کر کھاؤ تو خواہ کیسا ہی زود ہضم ناشتا ہو، سینے پر رکھ رہتا ہے۔ رہی کھانے کی بات تو کھانے کے وقت وہ عموماً باہر ہوتا ہے۔
”یہ سنا تم نے۔“ شہناز تلملا کر پروین سے بولی۔ ”سوت نہ کیاس کوری سے لٹھا۔“

”کنواری سے لٹھ لٹھا۔“ ٹکیل نے چونک کر پوچھا۔
”کنواری سے نہیں کوری سے۔ یہ ایک محاورہ ہے۔“ پروین کو بے اختیار ہنسی آگئی۔
”اس نے خاص طور پر تمہیں تو نہیں کہا تھا۔ تم کیوں برا مان رہی ہو۔“ بیگم شاکر بھی زیر لب مسکرا رہی تھیں۔

”آپ تو کچھ سمجھتی ہی نہیں امی۔“ شہناز منہ بسور کر بولی۔ ”ناشتے کی میز پر میرے آپ کے اور ابو کے علاوہ کون ہوتا ہے۔ ظاہر ہے وہ آپ کو اور ابو کو تو نہیں کہہ سکتے۔“
”میرا تو خیال ہے اس کا اشارہ گلشن کی طرف تھا۔“
”خیر کسی طرف بھی ہو مگر ان سے کہہ دیں کہ جب تک یہاں رہیں میرے سامنے نہ آئیں ورنہ پہلے دن تو لحاظ کر گئی تھی اب چپ نہیں رہوں گی۔ ایک کہیں گے تو دو سننا پڑیں گی۔“

”اچھا اچھا۔“ بیگم شاکر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”بھئی ٹکیل میاں تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کبھی کبھی آتے رہا کرو۔“

”کیا یہ اس بات کا اشارہ تو نہیں کہ اب مجھے رخصت ہو جانا چاہیے۔“ ٹکیل نے پروین کی طرف جھک کر بظاہر جیسے چپکے سے پوچھنا چاہا مگر آواز اتنی آہستہ نہیں تھی کہ بیگم شاکر نہ سن سکیں۔

”ارے نہیں ٹکیل بیٹی۔“ بیگم صاحبہ ہنسنے لگیں۔ ”جتنی دیر تمہارا دل چاہے بیٹھو۔ میں ابھی گلشن سے کہہ کر چائے بھجواتی ہوں۔“
وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔

لیجے جناب ششماہی امتحان میں تو آپ کامیاب ہو گئے۔“ پروین نے مسکراتے ہوئے

کہا۔ ”شہناز کی امی نے آپ کو پسند کر لیا۔ اب سالانہ امتحان باقی رہتا ہے تو کسی دن مناسب موقع دیکھ کر شہناز اپنے ابو سے بھی ملا دے گی۔ بس پھر بیڑا پار ہے۔“
”تمہارا سر پار ہے۔“ شہناز شرما گئی۔ ”میں تو امی کے کہنے پر ٹکیل صاحب کو لائی تھی۔“

”اسی طرح کسی دن ابو کے کہنے پر لے آنا میں کچھ اور تو نہیں کہہ رہی تھی۔ میرا مطلب بھی تو یہی تھا۔“ پروین نے شرارت سے کہا۔
”اچھا یہ بے کار کی باتیں ختم کرو اور یہ بتاؤ کہ ٹکیل صاحب کے سوٹ کا کیا انتظام کیا جائے۔“

”میرے گھر چلو تو میں بھائی جان کا کوئی سوٹ نکال کر دے سکتی ہوں شاید آجائے۔“
”یوں تو عدنان صاحب کے کسی سوٹ کو بھی آزمایا جاسکتا ہے۔“ شہناز نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”مگر شاید ٹکیل صاحب دوسرے کے استعمال شدہ کپڑے پہننا پسند نہ کریں۔“
”جی ہاں! میں تو صرف اپنے ہی استعمال شدہ کپڑے پہنتا ہوں۔“ ٹکیل نے فوراً کہا۔
”مگر اتنی جلدی دوسرا سوٹ سلوایا تو نہیں جاسکتا۔“ پروین بولی۔
”ریڈی میڈ تو خرید جاسکتا ہے۔“ شہناز نے ایک دم سے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
”یہاں سے نکل چلیں گے اور سینما جاتے ہوئے کسی بڑی دکان سے خرید لیں گے۔“
”مگر میں ابھی سوٹ خریدنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ ٹکیل نے کہا۔
”تو آپ سے خریدنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔“

”تو کیا اس شہر میں ریڈی میڈ والے سوٹ وغیرہ فری تقسیم کرتے ہیں۔“ ٹکیل نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہمارے شہر میں تو یہ کیفیت ہے کہ اگر خود سے سلوانے میں سوٹ تین ہزار کا بیٹھتا ہے تو ریڈی میڈ والے ساڑھے تین ہزار وصول کرتے ہیں۔ کہتے ہیں صاحب ہم نے سوٹ بنوا کر دیا ہے اس کا کمیشن بھی آپ دیں گے یا نہیں۔“
”میسے آپ مجھ سے قرض لے لیں۔“ شہناز نے آہستہ سے کہا۔
”آپ خواہ کتنے ہی چپکے سے کہیں مگر میں مزید قرض لینے کے لیے تیار نہیں۔“ ٹکیل

نے جواب دیا۔ ”ابھی پہلا قرضہ ہی ادا نہیں ہوا اور آپ پھر قرض دینے آگئیں۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ جیسے میرے پاس قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے کہ میں برابر آپ کا قرض ادا کیے چلا جاؤں گا۔“

پروین ہنسنے لگی۔

”آپ کے کہنے کا انداز تو ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی کو قرض دے رہے ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”بہر حال آپ شہناز سے لینا نہیں چاہتے تو مجھ سے لے لیں۔“

”ہاں! یہ ہو سکتا ہے۔“ ثکیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں ایک مرتبہ سے زیادہ کسی سے قرض لینے کا قائل نہیں ہوں۔“

”بس تو پھر طے رہا کہ ابھی چائے پی کر ایک گیم کیرم کھیلا جائے اور اس کے بعد ٹھیک آٹھ بجے ہم لوگ گھر سے نکلیں گے۔ راستے میں ثکیل صاحب کا سوٹ خریدتے ہوئے نو بجے تک پلس سینما پہنچ جائیں گے۔“ پروین نے پروگرام سنا دیا۔



امجد کہاں ہے۔“ قیصر نے مجیب سے پوچھا۔ ”اے ساتھ کیوں نہیں لائے؟“
 ”تمہارا فون ملتے ہی سیدھا چلا آ رہا ہوں۔“ مجیب نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے
 جواب دیا۔ ”ویسے اس وقت امجد گھر پر ہو گا بھی نہیں۔ کالج میں بتا رہا تھا کہ آج اے کسی
 کام سے صدر جانا ہے مگر کیا بات ہے؟“
 ”یہ ٹھیک اب سچ سچ کا رقیب بنتا جا رہا ہے۔“ قیصر نے بتایا۔ ”شہناز آج اے اپنے
 گھر بھی لے گئی۔ باکسنگ کا مقابلہ جیت کر وہ اپنے آپ کو ہیرو سمجھنے لگا ہے۔ میں چاہتا ہوں
 کہ اے تھوڑا سبق دے دیا جائے۔“
 ”کیا مطلب؟“

”شہناز پروین اور ٹھیکل آج رات کے شو میں پلس سینما جا رہے ہیں۔ شو ختم ہونے
 کے بعد جب وہ دونوں رخصت ہو جائیں تو کسی تاریک گلی میں ٹھیکل کے دو چار ہاتھ بھاڑ
 دینا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔“ قیصر نے جواب دیا۔
 ”گھبراؤ جلاؤ کی جو ترکیبیں اپنے سیاسی استادوں سے سیکھی ہیں۔ انہیں اب سیاست
 کے علاوہ محبت میں آزمانا چاہتے ہو۔“ مجیب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”مگر سوچ لو۔ یہاں بھی
 لینے کے دینے نہ پڑ جائیں گے۔“

”میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔“ قیصر نے دس روپے کا نوٹ رے میں ڈال کر اٹھتے
 ہوئے کہا۔ ”دو تین لڑکے میں اکٹھے کر لیتا ہوں۔ دو تین تم پکڑ لاؤ ہمیں کوئی سنگین حرکت
 نہیں کرنا ہے صرف دو دو ہاتھ مار کر چھوڑ دیں گے۔“

”نہ ملا اس وقت کوئی تو۔“ مجیب نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔
 ”تم جاؤ تو سہی، کوئی نہ کوئی ضرور مل جائے گا۔ ٹھیک نو بجے پلس سینما پہنچ جانا۔“
 قیصر نے جواب دیا۔ اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔

صدر کی سب سے بڑی دکان سے ٹکیل کا سوٹ خرید کر بلکہ وہیں اسے پہنا کر جب شہناز، پروین اور ٹکیل باہر آئے تو صرف ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ سیزمین نے ٹکیل کا پرانا سوٹ بڑی احتیاط سے پیک کر دیا تھا جواب اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔
 ”ابھی شو شروع ہونے میں آدھا گھنٹا باقی ہے۔“ پروین نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”کیا خیال ہے، کسی قریبی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کافی وغیرہ نہ پی لی جائے۔“
 ”تجویز اچھی ہے۔“ ٹکیل نے تائید کی بشرطیکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کافی کابل کون ادا کرے گا۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ آج آپ ہمارے مہمان ہیں، جملہ خاطر تواضع کے اخراجات ہمارے ہی سر پر ہیں گے۔“ پروین نے جواب دیا۔
 ”آپ لوگ تقسیم کار کیوں نہیں کر لیتیں۔“ ٹکیل نے کہا۔
 ”تقسیم کار۔“ شہناز نے چونک کر پوچھا۔

”جی ہاں۔“ ٹکیل نے پروین کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا مطلب ہے میری خاطر تواضع کے اخراجات اپنے سر لے لیں اور مجھے شہناز صاحبہ کے سر ڈال دیں۔۔۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔۔۔ خاطر تواضع۔۔۔۔۔ آپ تو سمجھتی ہی ہیں۔“

”جی ہاں! میں خوب سمجھتی ہوں۔“ پروین نے مسکرا کر شہناز کی طرف دیکھا جو اس طرح دوسری طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں مگر چہرے پر پھیلی ہوئی سرخی اس کی توجہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی۔

سامنے ہی ایک اچھا ریسٹورنٹ تھا۔ تینوں سڑک کر اس کر کے دوسری طرف چلے۔ ایک سفید پوش بڑے میاں جو ریسٹورنٹ دروازے کے قریب کھڑے ہوئے تھے، ان کی طرف بڑھے۔

”السلام علیکم“ وہ ٹکیل سے مخاطب ہوئے۔

”وعلیکم السلام۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔

”ایک پروسی مسافر کی چھوٹی سی درخواست سن سکتے ہیں۔“ بڑے میاں بولے۔

”آپ پروسی مسافر ہیں؟“ ٹکیل نے بڑے میاں کو غور سے دیکھا۔

”جی ہاں۔“

”اور آپ کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”بیوی بیمار ہے؟“

”جی ہاں۔“ اس مرتبہ کچھ تعجب کے ساتھ بڑے میاں نے جواب دیا۔

”اور چھوٹا بچہ دودھ نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ سوکھ کر کاٹنا ہو گیا ہے؟“

”جی ہاں بلکہ قریب المرگ ہے۔“ بڑے میاں نے بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔

”بڑے میاں پھر تو آپ خوب ملے۔“ ٹکیل نے ایک دم جوش کے ساتھ کہا۔

”پہلے وہ دس روپے واپس کیجئے جو آپ نوٹ تڑوانے کے بہانے مجھ سے لے گئے

تھے۔“

اب بڑے میاں گھبرائے۔

”بابو صاحب۔“ وہ جلدی سے بولے۔ ”خدا کی قسم آپ کو دھوکا ہوا ہے، وہ کوئی اور

کبخت چار سو بیس ہو گا۔“

”آپ کا مطلب ہے آپ کوئی دوسرے کبخت چار سو بیس ہیں۔“ ٹکیل نے بڑی

سادگی سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ بڑے میاں روانی میں کہہ گئے۔ شہناز اور پروین سے ہنسی ضبط نہیں

ہو رہی تھی مگر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر پوری طرح ہنس بھی نہیں سکتی تھیں۔ بڑے میاں

نے ان کی ہنسی دیکھ لی۔

”بابو صاحب۔“ وہ ناگواری سے بولے۔ ”غریب کی مصیبت کا مذاق اڑاتے ہو۔“

”برامت مانو بابا، یہ لو۔“ پروین نے جلدی سے پرس کھول کر ایک روپے کا نوٹ

بڑے میاں کے ہاتھ میں دے دیا اور ٹکیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آئیے ٹکیل صاحب چلیں۔“

”مگر وہ میرا دس روپے کا نوٹ۔“

”میں کہہ رہا ہوں بابو صاحب..... وہ کوئی اور.....“ بڑے میاں اپنی برادری والوں کو کوئی خطرناک گالی دیتے دیتے رک گئے۔

”آئیے ٹکیل صاحب۔“ شہناز نے بھی کہا۔ ”جب بڑے میاں کہہ رہے ہیں کہ یہ نہیں لے گئے تو ضرور کوئی اور ہوگا۔“

”آپ کہہ رہی ہیں تو چلئے مان لیتا ہوں ورنہ ساری علامتیں تو انہوں نے وہی بتائی ہیں۔“ ٹکیل نے ریٹورنٹ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ بڑے میاں کی جان میں جان آئی اور وہ کسی دوسرے شکار کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ریٹورنٹ میں شہناز اور پروین ایک پرائیوٹ کیمپن کی طرف جارہے تھے کہ شہناز نے ایک طرف دیکھتے ہوئے برا سامنہ بنایا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔

”کیا بات ہے؟“ پروین نے پوچھ لیا۔ ”کے دیکھ رہی ہو؟“

”دیکھ رہی ہوں کہ چچہ تو کرسی پر رکھا ہے مگر ہانڈی کہیں نظر نہیں آرہی ہے۔“

”ہانڈی“ ٹکیل نے حیرت سے کہا۔ ”کیا یہاں ہانڈیوں میں کافی پلائی جاتی ہے۔“

”آپ بھی کبھی کبھی خوب سنتے ہیں۔“ شہناز ہنسنے لگی۔

”میرا مطلب مسٹر امجد سے تھا۔“

”کیا وہ بھی یہاں موجود ہیں۔“ ٹکیل نے جلدی سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ پروین نے بھی امجد کو دیکھ لیا تھا۔ کیا آپ کو ان سے بھی کوئی نوٹ وصول کرتا ہے۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا۔“ ٹکیل نے حیرت سے پروین کی طرف دیکھا۔

”کیا؟“ پروین چلتے چلتے رک گئی۔ ”میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا۔ آپ نے سچ سچ

انہیں بھی کوئی دس روپے کانوٹ دیا ہے۔“
 ”دس روپے کانوٹ نہیں۔ انگریزی کے نوٹس۔ میں آج انگلش کاپیریٹائڈ نہیں
 کر سکا تھا۔“ ٹکیل نے امجد کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ لوگ چلیں میں ابھی
 آتا ہوں۔“

شہناز اور پروین کیمین کی طرف بڑھ گئیں اگر وہ گھوم کر ٹکیل کو دیکھ لیتیں تو انہیں
 تعجب ہوتا کہ وہ امجد کے پاس جانے کے بجائے ریسٹورنٹ سے باہر جا رہا تھا۔
 ”بابا۔“ ٹکیل نے بڑے میاں کے قریب آتے ہوئے کہا۔
 ”بابو صاحب! میں اتنی بڑی قسم کھا چکا ہوں مگر آپ کو۔۔۔۔۔“
 ”گھبرائیے نہیں میں دس کانوٹ واپس لینے کے لیے نہیں آیا بلکہ ایک پچاس کانوٹ
 آپ کو دینے آیا ہوں۔“

”جی“ بڑے میاں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔
 ”جی ہاں! ٹکیل نے یقین دلایا۔ ”بس آپ کو میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا پڑے گا۔
 یوں سمجھئے تین گھنٹے کی مزدوری۔“

”کیا کام ہے۔“ بڑے میاں اب بھی اسے شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
 ”بہت معمولی سا کام ہے۔“ ٹکیل نے بتایا۔ ”اس وقت نو بجتے میں بیس منٹ ہیں۔
 آپ دو منٹ کے بعد اندر ریسٹورنٹ میں جا کر ایک کونے والی میز پر بیٹھ جائیں گے۔“
 ”میز پر۔“ بڑے میاں نے تعجب سے پوچھا۔
 ”نہیں، بیٹھیں گے تو آپ کرسی پر ہی۔“
 ”اچھا پھر۔“

”پھر یہ کہ وہاں آپ پورے گیارہ بجے تک بیٹھے رہیں گے۔ وقت کا اندازہ آپ
 ریسٹورنٹ کی گھڑی سے کر سکتے ہیں۔“
 ”معاف کیجئے بابو صاحب۔“ بڑے میاں ناگواری سے بولے۔ ”آپ کی کلائی پر کوئی
 گھڑی بندھی ہے۔“

”سٹیزن ہے۔“ ٹکیل نے حیرت سے پوچھا۔

”اور میں راڈو سے کم درجہ کی گھڑی باندھنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔“ بڑے میاں نے ڈھیلے ڈھالے کرتے کی آستین چڑھاتے ہوئے اپنی کلائی دکھائی جہاں ایک چمک دار سنہری گھڑی بندھی ہوئی تھی۔

”بہت خوب۔“ ٹکیل مسکرایا۔ ”پھر تو وقت کے بارے میں گڑبڑ کا اندیشہ نہیں۔ تو گیارہ بجے تک آپ ریسٹورنٹ میں تشریف رکھیں گے۔ پھر یہاں سے اٹھ کر پبلک سینما تک جائیں گے۔ پبلک سینما تو آپ نے دیکھا ہوگا؟“

”بابو صاحب کوئی سینما ایسا نہیں جو اندر باہر سے خوب اچھی طرح نہ دیکھ لیا ہو۔“ بڑے میاں نے بڑے طنزیہ لہجے میں بتایا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ وہاں دس پندرہ منٹ ٹھل کر شو ختم ہونے کے فوراً بعد آپ بھی ڈیوٹی ختم کر کے جاسکتے ہیں۔“ ٹکیل نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر بڑے میاں کو دیتے ہوئے کہا۔ ”ایک بات کا خیال رکھیے گا۔“ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ پیسہ ہضم اور ڈیوٹی ختم۔“

”اٹھمیان رکھو بابو صاحب، آپ کا کام کر کے ہی اپنا دھندا شروع کروں گا۔“ بڑے میاں نے یقین دلایا۔

”ٹکیل دوبارہ ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔“

”غالبا آپ نے مجھے پہلے کہیں ضرور دیکھا ہوگا۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا پارسل میز پر رکھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے امجد کے سامنے بیٹھ گیا۔

”جی۔“ امجد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ کئی لمحے وہ اسے حیرت سے گھورتا رہا پھر اچانک اس کی آنکھوں میں پہچان کے تاثرات ابھر آئے۔

”اوہ! ٹکیل صاحب۔“ وہ بڑے حیران لہجہ میں بولا۔ ”آج تو آپ بدلے بدلے سے نظر آتے ہیں۔ سچ اگر آپ کا چشمہ نہ ہوتا تو میں بالکل نہیں پہچان پایا تھا۔“

”جی ہاں! اسی کو ایک فلمی شاعر نے یوں کہا ہے کہ بدلے بدلے سے میرے سرکار نظر

آتے ہیں۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔ ”ویسے آپ ذرا غور سے دیکھیں میں تو وہ ہی ہوں البتہ سوٹ ضرور بدل گیا ہے۔“

”اور بظاہر اس معمولی سی تبدیلی نے آپ کو حیرت انگیز طور پر ایک دوسری ہی شخصیت بنا دیا ہے۔“ امجد نے کہا۔ ”آپ کا وہ سوٹ آپ کے ساتھ کچھ ایسا لازم و ملزوم ہو گیا تھا کہ اب قیصر صاحب بھی آپ کو دیکھیں تو پہلی نگاہ میں نہیں پہچان سکتے اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ اب آپ پہلے سے کہیں زیادہ اسمارٹ لگ رہے ہیں۔ سچ بتائیے گا یہ خیال آپ کا تھا یا کسی اور کی نگاہ کرم کا صدقہ ہے۔“

”ابھی یہ بات راز ہی رہنے دیں۔“ ٹکیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ بتائیے آپ اکیلے ہیں یا کوئی اور بھی آپ کے ساتھ ہے۔“

”فی الحال تو اکیلا ہی ہوں۔“ امجد نے بتایا۔ ”ایک دوست سے ملنے کا وعدہ کیا تھا مگر اب تک وہ آئے نہیں ہیں۔“

”اور خدا نے چاہا تو آج کی تاریخ میں آئیں گے بھی نہیں۔“ ٹکیل نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”آپ کو کیسے معلوم؟“ امجد مسکرایا۔

”اس لیے کہ آج جو سیارگان برج حمل و نقل میں جمع ہیں علوم نجوم کی رو سے وہ صرف جانے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ آپ ہنس رہے ہیں مگر یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔ ”سنئے سب سے پہلے صبح اٹھتے ہی پتا چلا کہ دودھ والا نہیں آیا چنانچہ چائے کے لیے دودھ خریدنا پڑا اور مبلغ دو روپیہ نقد جیب سے چلے گئے پھر کپڑوں کے لیے لائڈری پہنچا تو اس نے بتایا کہ کپڑے ابھی دھل کر نہیں آئے گھر واپس آ رہا تھا تو یاد آیا کہ آج صبح اخبار والا بھی نہیں آیا۔ سوچا بازار سے خریدتا چلوں مگر دیکھا تو بازار میں سارے ہاکر اپریل کی خوشگوار دھوپ کھا رہے ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ آج ہڑتال ہے اور اخبارات ہی نہیں آئے۔“

”کلج جانے کے لیے بس اسٹاپ پہنچا تو گھٹنا بھر تک کوئی بس نہیں آئی، مجبوراً رکشہ

کرنا پڑا۔ اب رکشہ والا لے کر چلا تو کسی طرح کالج ہی نہیں آ رہا تھا۔ تحقیق کی تو رکشہ والے نے بتایا کہ وہ اس شہر میں نووارد ہے اور اسے کالج کا رستہ نہیں معلوم۔ میں نے کہا تو پھر بھیا گھر ہی پہنچا دو اس لیے کہ میں بھی اس شہر میں اجنبی ہوں اور صرف گھر سے ہی کالج کا راستہ پہچان سکتا ہوں۔ وہ گھر واپس لا رہا تھا کہ کالج جا پہنچا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ رکشہ کا میٹر دیکھا تو افسوس ہوا کہ شکر ادا کرنے میں بہت جلدی کی میٹروس روپے کچھ پیسے بتا رہا تھا نتیجہ یہ کہ وہ بھی جیب سے گئے کالج میں جانے آنے کی تفصیل پیش کروں تو صبح ہو جائے گی۔ اس لیے صرف ایک تازہ واقعے پر اپنی داستان ختم کرتا ہوں ابھی شہناز اور پروین کو کیبن میں چھوڑ کر سگریٹ خریدنے باہر۔۔۔

”کیا! کسے چھوڑ کر۔“ امجد نے چونک کر پوچھا۔

”شہناز اور پروین کو۔“ ٹھیکل نے خود بھی حیرت ظاہر کی۔ ”ارے بھئی دو لڑکیاں ہیں اپنے کالج ہی میں پڑھتی ہیں۔ آپ نہیں جانتے انہیں۔“

”تو وہ آپ کے ساتھ یہاں ریسٹورنٹ میں آئی ہیں۔“ امجد نے تعجب سے کہا۔
 ”بالکل آئی ہیں بلکہ یہاں سے میرے ساتھ سینما بھی جائیں گی۔“ ٹھیکل نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔

”تو اس سوٹ کی شان نزول یہ تھی۔“ امجد ہنسنے لگا۔ ”خیر آپ اپنی بات پوری کریں۔“

”ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ ان دونوں کو کیبن میں چھوڑ کر سگریٹ خریدنے باہر گیا تو فٹ پاتھ پر انسپکٹر نیازی مل گئے وہ آلو چھولوں کا خوانچہ لگائے کھڑے تھے۔“

”کون۔“ امجد نے ٹھیکل کو گھورا۔ ”کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔“

”ارے بھائی اپنے انسپکٹر نیازی جو خفیہ پولیس میں کام کرتے ہیں۔“

امجد نے کسی قدر حیرت سے جواب دیا۔ ”مگر۔۔۔ آلو چھولوں کا خوانچہ! بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“

میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی مگر انہوں نے بتایا کہ وہ ایک بین الاقوامی اسمگلری

نگرانی کر رہے ہیں اور یہ کہ خوانچہ ان کا نہیں ہے بلکہ انہوں نے خوانچے والے کو دس پانچ روپے دے کر ٹھلا دیا ہے۔ تفصیل پوچھنے پر انسپکٹر نیازی نے مزید بتایا کہ وہ اسمگلر یہاں ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اسے یہاں ایک گاہک کا انتظار ہے جس کے ہاتھ وہ اسمگل شدہ ہیرے فروخت کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ تو پھر اسے گرفتار کیوں نہیں کر لیتے۔ وہ بولے کہ میں اس کے پورے گروہ کو گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک آدمی آیا اور اس نے ایک روپے کے چھوٹے مائیکے چھوٹے لے کر اس نے پانچ روپے کا نوٹ دیا اور بقیہ روپے لیے بغیر واپس چلا گیا۔ میں اسے آواز دینے ہی لگا تھا کہ انسپکٹر صاحب نے منع کر دیا۔ بتایا کہ یہ بھی خفیہ کا آدمی ہے، ایک پیغام لے کر آیا تھا اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ چیف انسپکٹر نے کسی بہت ضروری کام سے فوراً بلایا ہے اور میں اس اسمگلر کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اگر تم اتنی دیر اس کی نگرانی قبول کر لو کہ میں چیف انسپکٹر صاحب کو سارے حالات بتا کر واپس آ جاؤں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں نے ہر چند عذر پیش کیا کہ میرے ساتھ ایک نہیں دو دو لڑکیاں ہیں، ان کی نگرانی کرنا ہی بڑا مشکل ہے۔ میں آپ کے اسمگلر کی نگرانی کیسے کر سکتا ہوں مگر انسپکٹر صاحب اتنے سر ہوئے کہ مجھے ہاں کرنا پڑی چنانچہ وہ اٹھ کر چلے گئے۔ کہا یہ تھا کہ چیف انسپکٹر صاحب برابر کی گلی میں بلدیہ کے بیت الخلا کے انچارج کے میک اپ میں بھٹکی بنے بیٹھے ہیں، میں ان سے بات کر کے بس ابھی پانچ منٹ میں آیا۔ مگر پانچ کے پندرہ منٹ ہو چکے ہیں، انسپکٹر صاحب ابھی تک نہیں آئے اگر کہیں ان کے جانے سے پہلے مجھے یاد آ جا تا کہ آج کا دن صرف جانے والوں کے لیے مبارک ہے تو میں ہر گز یہ ذمہ داری قبول نہیں کرتا خواہ وہ ایک سو کے بدلے ایک ہزار روپے دیتے۔“

”کیا! امجد چونکا۔“ انسپکٹر صاحب نے آپ کو اس ذرا سے کام کے لیے سو روپے دیے ہیں۔“

”ارے یہ ذرا سا کام ہے۔“ کلکیل نے جیسے برا مانتے ہوئے کہا۔ ”اب بتاؤ میں شہناز اور پروین کے ساتھ کچھ جاؤں یا اس اسمگلر کی چوکیداری کروں میں تو عجیب مصیبت میں

پھنس گیا ہوں۔“

امجد مسکرایا۔

”اگر میں آپ کی جان اس مصیبت سے چھڑا دوں تو آپ کیا انعام دیں گے؟“

بولا۔

”خدا آپ کو سلامت رکھے۔“ ٹھیکل ایک دم خوش ہو گیا۔ ”اگر ایسا ہو جائے؟“

کہنے۔ انعام میں ایسی دعائیں دوں گا کہ آپ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔“

”صرف دعائیں۔“

”تو پھر۔“

”اس سوکے نوٹ کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”ہوں!“ ٹھیکل نے گہری سانس لی۔ ”چلئے دس بیس روپے آپ بھی لے لیں۔“

”جی نہیں پورے پتے کی بات کریں۔“

”پچاس۔“

”بالکل نہیں۔“

”اچھا پچھترسی۔“ آخر میں نے بھی تو کچھ نگرانی کی ہے۔“ ٹھیکل نے جیسے دل

جبر کر کے کہا۔

”چلئے آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ لائیے نکالے۔“

”ترکیب بھی تو بتائیے۔“

”ترکیب کیا؟ آپ جائیے۔ اطمینان سے پکچر دیکھیے، اس کی نگرانی میں کر لوں گا۔“

امجد نے جواب دیا۔

”واللہ کیا بات کی۔ حیرت ہے اتنی آسان سی ترکیب میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

ٹھیکل نے کہا۔ ”ورنہ یہیں ریٹورنٹ کے کسی بیرے کو دس بیس روپیہ دے کر بھی

نکالا جاسکتا تھا۔“

”اب تو جو کچھ ہوتا تھا ہو چکا۔“ امجد نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”پچھتر روپے نکالے۔“

سیدھے ہاتھ سے۔“

”اچھا بھائی جان آپ بھی کیا یاد کریں گے کسی دل والے سے پالا پڑا تھا۔“ ٹکیل نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ چل کر کیبن میں بیٹھیں میں کاؤنٹر سے سوکانوٹ تڑا کر لاتا ہوں۔ وہ دونوں اس سامنے کے کیبن میں ہیں۔“

”اور وہ اسمگلر۔“ امجد نے بھی ساتھ ہی اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“ اسے بھی تو دکھادیں ورنہ میں نگرانی کس کی کروں گا؟“

”اسمگلر صاحب وہ اس کونے کی میز پر بیٹھے ہیں۔“ ٹکیل نے بڑے میاں کی طرف اشارہ کیا۔

”اچھا۔“ امجد نے بڑی دلچسپی سے بڑے میاں کی طرف دیکھا جو اس وقت اسپیشل چائے پینے میں مصروف تھے۔

”تو پھر آپ چلے میں آتا ہوں۔“ ٹکیل نے میز سے اپنے پرانے سوٹ کا پارسل اٹھایا اور کاؤنٹر کی طرف چل دیا۔

امجد کیبن میں داخل ہوا تو ٹکیل کاؤنٹر کے بجائے ایک ویٹر کی جانب گھوم گیا۔ ”یہ لوپانچ روپے۔“ اس نے ایک نوٹ ویٹر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”ایک فل پلیٹ آلو کا شوربہ، دو چپاتی، پاؤ بھر دی، ایک پلیٹ ٹماٹر کی چٹنی، دو انڈے ایک پلیٹ میں کچے یونی توڑ کر۔ یہ چیزیں جلدی سے کیبن میں لے جاؤ۔ یہ آرڈر ان لوگوں کا نہیں ہے اس لیے ظاہر ہے وہ نہیں لیں گے۔ تم کہو گے معاف کیجئے گا صاحب یہ آرڈر دوسرے کیبن کا تھا۔ میں غلطی سے یہاں لے آیا۔ یہ کہہ کر تم واپس آنے کے لیے جیسے ہی مڑو گے اسی وقت میں آجاؤں گا۔ مجھ سے ٹکراؤ گے اور پوری ٹرے ان صاحب کے سر پر گرے گی جو کیبن میں بیٹھے ہیں۔ سمجھ گئے؟“

”اچھی طرح سمجھ گیا جناب مگر۔۔۔۔۔“

”ٹوٹنے والے برتنوں کا ٹیل علیحدہ دیا جائے گا۔“ ٹکیل نے اس کی بات کاٹی۔

”وہ تو ٹھیک ہے صاحب۔ لیکن میرے ٹوٹنے والے سر کا ٹیل پانچ روپے تو نہیں زیادہ

بنے گا۔“ ویٹر بولا۔

”تمہارا سر ٹوٹنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اگر آتی تو اس کے چار جز تم الگ وصول کر سکتے ہو۔“

”پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ ویٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اور کچن کی طرف چل دیا۔

ایک منٹ بعد فکیل نے اسے ٹرے اٹھائے کیبن میں جاتے دیکھا۔ وہ بھی آہستہ قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھا۔ کیبن میں داخل ہوا۔

”معاف کیجئے گا جناب۔“ ویٹر بڑے شرمندہ لہجے میں امجد سے مخاطب تھا۔ ”ایک صاحب نے کھانے کا آرڈر دیا اور کہا کہ کیبن میں لے کر آؤ، میں ٹھیک سے یہ نہیں دیکھ سکا کہ وہ کس کیبن میں جا کر بیٹھے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ یہاں آئے ہوں گے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے ہی کیبن میں چلے گئے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ امجد نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

اسی وقت شہناز کی نظر فکیل پر پڑی۔

”آپ آئے تو۔“ وہ بولی۔ ”ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آج کچر کا پروگرام کینسل ہی کرنا

پڑے گا۔

ویٹر ٹرے لیے واپس مڑا۔ فکیل شہناز کی طرف متوجہ تھا۔

”میں آپ سب سے بے حد شرمندہ ہوں مگر۔۔۔۔۔“ اس نے آگے قدم بڑھایا اور

ویٹر نے بظاہر ٹرے گرنے سے بچانے کے لیے جلدی سے دوسرے ہاتھ میں لینا چاہی اور یہ

دوسرا ہاتھ عین امجد کے سر پر تھا، ٹرے گری۔ ویٹر اور فکیل خود بھی الجھ کر میز پر لڑھک

گئے۔ شہناز اور پروین جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ کھڑا امجد بھی ہوا اور اس طرح کہ شور بہ

دہی ٹماٹر کی چٹنی اور ٹوٹے ہوئے انڈوں کو پورا موقع مل گیا کہ وہ اس کے سوٹ پر پھیل

سکیں۔

”معافی چاہتا ہوں جناب۔ معافی چاہتا ہوں“ ویٹر ہاتھ جوڑ کر امجد کے سامنے کھڑا

ہو گیا۔

”معافی کے بچے۔“ امجد چیخ کر بولا۔ ”یہ جو سارے سوٹ کا ستیاناس ہو گیا اس کا نقصان کون برداشت کرے گا۔ تیرا باپ۔“

”تھکیل جلدی سے رومال نکال کر اس کا سوٹ صاف کرنے لگا۔“

”چیخ چیخ یہ تو واقعی نملا دیا اس نے آپ کو کھانے میں۔“ اس نے ہمدردی سے کہا۔

”مگر غلطی اس کی نہیں، میری ہے۔ میں اس سے ٹکرا گیا تھا۔“

وہ ویٹر کی طرف گھوما۔

”اب یہ گندگی سمیٹو یہاں سے اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔“ اس نے ڈانٹ کر کہا۔ ویٹر نے جلدی سے گری ہوئی پلیٹیں اٹھائیں۔ اتفاق سے ایک کے علاوہ سب پلیٹیں ثابت تھیں۔ کپڑے سے میز اور فرش صاف کیا اور چپ چپ رے اٹھا کر کین سے نکل گیا۔

”آپ کا تو سارا سوٹ خراب ہو گیا۔ اب اس حلقے میں گھر کیسے جائیں گے؟“ شہناز بولی۔

”غنیمت ہے کہ شور بے کی پلیٹ علیحدہ ہی گری۔“ پروین نے کہا۔ ورنہ چکناچی کے دھبے نہیں جاتے۔“

”پھر بھی پچاس ساٹھ روپے ڈرائی کلیتہً پر تو خرچ ہو ہی جائیں گے۔“ تھکیل نے بدستور سوٹ صاف کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے علاوہ ایک اور نقصان کا اندیشہ بھی ہے۔“

اس نے معنی خیز نظروں سے امجد کو دیکھا۔ جواب بھی تک بڑا برا منہ بتائے ہوئے تھا۔

”کیسا نقصان؟“ شہناز نے چونک کر پوچھا۔

”آپ میرا سوٹ پہن لیں۔“ تھکیل نے بندھے ہوئے پارسل کی جانب اشارہ کیا۔

”ہو تو سکتا ہے۔“ امجد نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”مگر یہ سوٹ جب آپ کے بڑا تھا تو میرے کیسے فٹ آئے گا؟“

”میرا اور آپ کا قد و قامت تقریباً ایک ہی جیسا ہے۔“ تھکیل نے جواب دیا۔ ”اور

میرے یہ سوٹ بالکل فٹ تھا۔

”فٹ تھا۔“ شہناز ہنسنے لگی۔

”بہر حال جیسا بھی تھا امجد کے لیے اس سے زیادہ تو کچھ نہ ہوگا۔“ پروین نے کہا۔
”اس کے علاوہ وہی اور ٹائٹ کی چٹنی میں لتھڑے ہوئے سوٹ سے تو پھر بھی غنیمت رہے گا۔“

”مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ آخر وہ کون صاحب تھے جو کھانے میں کچے انڈے بھی نوش فرماتے ہیں۔“ شہناز نے کہا۔

”یہ دنیا بھی عجیب شوق رکھنے والوں سے بھری ہوئی ہے۔“ ٹھکیل جلدی سے بولا۔
”آپ اتنی حیرت کہاں سے لائیں گی کہ جو ان سب پر تقسیم کر سکیں۔“
وہ امجد کی طرف متوجہ ہوا۔

”یہ لیجئے امجد بھائی آپ تو جلدی سے ٹوائلٹ میں جا کر سوٹ تبدیل کر لیں۔“ اس نے پارسل اٹھا کر امجد کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

پانچ منٹ کے بعد امجد ٹھکیل کا سوٹ پہنے اور اپنے سوٹ کا پارسل بنائے کیبن میں داخل ہوا تو کافی کی پیالی اس کے انتظار میں ٹھنڈی ہو رہی تھی اور شہناز جلدی اٹھنے کے لیے بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے سوٹ ایسا برا تو نہیں رہا۔“ ٹھکیل نے داد طلب نظروں سے پروین کی طرف دیکھا۔

”برا۔“ پروین نے جلدی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ امجد صاحب آج تک اپنے کسی سوٹ میں بھی اتنے اسارٹ نہیں دکھائی دیے ہوں گے جتنے میری آنکھوں میں خاک۔ اس وقت نظر آرہے ہیں۔“

”اچھا اب بنائیے مت۔“ امجد نے ایک شرمندہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
”تو بج کر دو منٹ ہو رہے ہیں۔“ شہناز نے اٹھتے ہوئے کہا ”پکچر شروع ہو گئی تو کیا مزا آئے گا۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ پروین بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”اچھا امجد صاحب اب ہمیں اجازت دیں۔“ ٹکیل نے کہا اور شہناز کی طرف دیکھ
 بولا۔ ”میرا ٹکٹ مجھے دے دیں اور آپ لوگ چل کر بیٹھیں میں ابھی امجد صاحب سے
 ضروری بات کر کے آتا ہوں۔“

”آج آپ بہت بور کر رہے ہیں ٹکیل صاحب۔“ وہاں شہناز کے گھر پر گیم چھوڑ کر ہٹا
 کس سے ایک گھنٹا تک باتیں کرتے رہے اور اب۔“

”خدا کے غضب سے ڈریے پروین صاحبہ۔“ ٹکیل نے جلدی سے بات کاٹی۔
 ”تو میں کسی کو خود سے فون نہیں کیا تھا اب کسی دوست کا فون آگیا تو کیا بات بھی نہیں
 آتا۔ دوسرے صرف ایک منٹ کے لیے اٹھ گیا تھا جسے آپ نے گھنٹا بھر بتا دیا۔“

”اچھا اب مزید باتوں میں وقت ضائع مت کیجئے۔“
 ”شہناز نے پرس سے ٹکٹ نکال کر ٹکیل کو دیا۔“ جلدی آئیے گا ورنہ آپ کو ہال
 خالی سیٹیں ہی ملیں گی۔ ہم دونوں نہیں ملیں گے۔“

شہناز اور پروین کے جانے کے بعد ٹکیل رازدارانہ انداز میں امجد کی طرف جھکا۔
 ”میں صرف ایک ضروری بات بتانا بھول گیا تھا۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”انسپکٹر
 نازی کہہ رہے تھے کہ ممکن ہے کوئی اس اسمگلر سے ملے نہ آئے اور وہ خود کسی سے ملنے
 کے لیے جائے۔ ایسی صورت میں اس کا پیچھا کرنا پڑے گا مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ وہ یا
 کوئی اور آپ کو پیچھا کرتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ اس سے دس پندرہ قدم پیچھے رہیے اور منہ
 کوئی رومال وغیرہ اس طرح رکھ لیجئے یا کوٹ کے کالر کھڑے کر کے چہرہ اس طرح چھپا لیجئے
 کہ وہ آپ کو شناخت نہ کر سکے۔ ممکن ہے اس نے آپ کو ریٹورنٹ میں بیٹھے دیکھ لیا ہو۔
 اس لیے جب اپنے پیچھے آتے دیکھے گا تو ضرور ہوشیار ہو جائے گا پھر جہاں کہیں وہ جائے
 اس کی قریبی فون بوتھ سے ہیڈ کوارٹر میں انسپکٹر نازی کو فون کر دیں۔“

امجد نے کافی پیتے ہوئے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا۔ ٹکیل نے جیب سے پچھتر
 روپے کے نوٹ نکال کر میز پر رکھے اور کیبن سے باہر نکل گیا۔

”یہ تم نوبت آئے ہو۔“ قیصر نے سخت لہجے میں مجیب سے کہا۔

”اس میں میری غلطی نہیں۔“ مجیب نے جواب دیا۔ ”رشد نے کہا تھا کہ جب سب لوگ جمع ہو جائیں تو جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے لوں مگر جب اس کے گھر پہنچا تو اس نے انکار کر دیا بس اسی میں دس منٹ کی تاخیر ہو گئی۔ اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ ہمارا کام تو کچھ ختم ہونے کے بعد ہی شروع ہو گا۔ چند منٹ کی دیر سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”یہ فرق پڑتا ہے کہ اب دو ڈھائی گھنٹے تک سینما کے باہر آوارہ گردی کرنا پڑے گی۔“

قیصر بدستور غصے میں بولا۔ ”میں نے سوچا تھا کہ ہم لوگ کسی دوسرے کلاس میں بیٹھ کر کچھ دیکھ لیں گے مگر تم اتنی دیر سے آئے ہو کہ ہاؤس فل ہو چکا ہے۔“

”تو آپ پہلے سے ٹکٹ لے لیتے۔“

”کیسے لے سکتا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اپنے ساتھ کتنے آدمی لے کر آرہے ہو؟“

”یہ بھی صحیح ہے۔“ مجیب نے گردن ہلائی۔ ”مجھے صرف تین لڑکے مل سکے۔“

”دو میرے ساتھ بھی ہیں۔“ قیصر نے بتایا۔

”وہ لوگ آگئے۔“ مجیب نے پوچھا۔

”ایک پریشانی یہ بھی ہے۔“ میں نے شہناز اور پروین کو تو آتے دیکھا مگر ان کے ساتھ شکیل نہیں تھا۔“ قیصر نے جواب دیا۔

”یہ کیا اس کا مطلب ہوا کہ ساری دوڑ دھوپ بالکل بے کار گئی۔“

”ابھی کیسے کہا جاسکتا ہے۔“ قیصر نے کہا۔ ”میں نے بنگلہ پر معلوم کیا تھا گیلری کی کوئی سیٹ کینسل نہیں کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ شکیل اتنا حسین موقع کیسے ہاتھ سے جانے دے سکتا ہے یا تو وہ پہلے سے آکر ہال میں بیٹھ گیا ہو گا یا پھر ممکن ہے کچھ لیٹ آئے اگرچہ الگ آنے کی کوئی وجہ اس کے علاوہ سمجھ میں نہیں آتی کہ شاید وہ لوگ ساتھ نہ روانہ ہوئے ہوں۔“

”پھر اب کیا کیا جائے؟“

”تمہارے ساتھ کے لڑکے کہاں ہیں؟“

”وہ سب سینما کے باہر سامنے والے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہیں۔“

”بس تو پھر ہم بھی چل کر وہیں بیٹھتے ہیں۔“ قیصر نے کہا۔ ”دو ڈھائی گھنٹے کا وقت گزارنا

ہی ہے۔“

”ایک بات کی طرف تم نے غور نہیں کیا۔“ مجیب بولا۔

”اگر واپسی میں ٹھیکل شہناز کی کار میں ہی ساتھ گیا تو۔“

”تو پھر ہم بھی کسی ٹیکسی میں اس کا تعاقب کریں گے۔ آخر وہ کہیں تو کار سے اتر کر

اپنے گھر جائے گا ہی۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”اور میں یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں کہ

اتنی رات گئے شہناز اسے گھر تک چھوڑنے جائے گی۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے سینما سے باہر نکل کر سڑک پر آگئے اور پھر سڑک کر اس

کرتے ہوئے سینما کے بالمقابل بنے ہوئے ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہ باتوں میں اتنے

محو تھے کہ انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ ٹھیکل ان کے قریب ہی سے گزرتا ہوا اندر گیا مگر

وہ اسے دیکھتے بھی تو شاید نہ پہچان سکتے۔ اس وقت ٹھیکل نے چشمہ بھی اتار کر جیب میں رکھ

لیا تھا۔

ریسٹورنٹ میں بھی قیصر نے اتنا اہتمام کر رکھا تھا کہ باری باری ایک لڑکا مستقل سینما

کے گیٹ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا تھا۔ ہاف ٹائم میں تو قیصر نے خود اٹھ کر ایک چکر لگایا تھا

مگر شہناز پروین یا ٹھیکل میں سے کوئی باہر نہیں نکلا۔ گیٹ کیپر سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ کوئی

سیٹ خالی نہیں ہے اس کا مطلب تھا کہ ٹھیکل آچکا تھا مگر کس وقت آیا۔ یہ بات قیصر کی

سمجھ میں آخر تک نہیں آئی۔

گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے اچانک..... مجیب نے اس کا کندھا ہلا کر اپنی طرف

متوجہ کیا۔

”ذرا سینما کے اندر دیکھنا۔“ مجیب آہستہ سے بولا۔

قیصر نے دیکھا کہ ٹکیل کوٹ کا کار اٹھائے آئندہ لگنے والی پکچر کی تصویریں دیکھ رہا ہے۔

”یہ۔۔۔ یہ ہال سے باہر کیوں نکل آیا۔“ قیصر نے بڑی حیرت سے کہا ”اور شہناز وغیرہ کہاں ہیں۔“

”میرا خیال ہے ٹکیل صاحب عقل سے کورے تو ہیں ہی۔“ مجیب نے کہا۔ ”سنیما کے اندر کوئی حرکت کر بیٹھے ہوں گے اور شہناز یا پروین نے انہیں گیٹ آؤٹ کر دیا ہوگا۔“

”ممکن ہے۔“ قیصر نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے یوں ہی کہہ دیا ہے ورنہ وہ اس بات کو قابل یقین خیال نہیں کرتا۔

ٹکیل کوئی دس منٹ تک تصویریں دیکھتا رہا پھر اچانک وہ گیٹ کی طرف گھوم کر باہر نکل گیا۔ قیصر نے جلدی سے مجیب کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ رکھا کہ وہ کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کرے اور خود اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا۔ ٹکیل اس سے تیس چالیس قدم کے فاصلے پر تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بڑا سا پارسل بھی دبا ہوا تھا جسے وہ چلتے ہوئے کبھی سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیتا اور کبھی بائیں ہاتھ میں۔ قیصر نے کچھ تعجب کے ساتھ نوٹ کیا کہ ٹکیل سے دس پندرہ قدم آگے کوئی بڑے میاں جا رہے ہیں وہ جس طرف گھومتے ہیں ٹکیل اسی طرف مڑ جاتا ہے۔

”یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ بڑے میاں ٹکیل کو کہیں ساتھ لے جا رہے ہیں۔“ ایک لڑکا بولا۔

”یا پھر ٹکیل کسی نامعلوم وجہ سے ان کا تعاقب کر رہا ہے۔“ مجیب بھی آگیا تھا۔
 ”اگر یہ لوگ پلٹ کر دیکھ لیتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ پیچھا کرنے والوں میں ان کے اور ٹکیل کے علاوہ ایک ٹیکسی بھی ہے جو بہت آہستہ رفتار سے ان سے بیس پچیس قدم کے فاصلے پر چلی آرہی ہے۔ اچانک بڑے میاں تنگ سی گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہی ٹکیل بھی گھوم گیا۔“

”یہ گلی اپنے کام کے لیے بہت اچھی ہے۔“ قیصر نے مجیب سے کہا۔ ”تم تین لڑکوں کو اپنے ساتھ لے کر اس کے برابر والی گلی سے بھاگتے ہوئے جاؤ اور ٹھکیل کے پہنچنے سے پہلے گلی کا راستہ گھیر لو۔ میں اس طرف سے آگے بڑھتا ہوں۔ بڑے میاں کو نکل جانے دینا اور ٹھکیل کا بچہ نہ نکلنے پائے۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ مجیب نے تینوں ساتھیوں کے ساتھ بھاگ کر دوسری گلی میں جاتے ہوئے کہا۔

قیصر جلدی سے باقی دو لڑکوں کو لیے ہوئے گلی میں داخل ہوا۔ کچھ فاصلے پر ٹھکیل ایک دیوار کے دروازے کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ بڑے میاں کا کوئی پتا نہ تھا۔ قیصر اور اس کے دوست مکانات کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ جب فاصلہ بمشکل دس پندرہ قدم ہو گیا تو شاید ٹھکیل نے قدموں کی آہٹ سن لی تھی کہ وہ چونک کر اندھیرے میں آنے والی آوازوں کی سمت گھومنے لگا۔ قیصر نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو رکنے کے لیے کہا وہ اب اسی طرح تاک لگا رہے تھے جیسے کوئی درندہ اپنے شکار پر جھپٹنے سے پہلے تیاری کرتا ہے۔

”ہاں دوستو! قیصر نے دبی آواز میں مگر پر جوش لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی سب ٹھکیل پر جا پڑے۔

”ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ ارے۔۔۔“ ایک گھبرائی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ آپ لوگ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟“

فوراً ہی نصف درجن گھونے لائیں، کئے اور تھپڑ رشنا شروع ہو گئے۔

”بچاؤ۔ ارے کوئی بچاؤ۔“

”مجبب دوسری طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور آتے ہی اس نیک کام میں شریک ہو گیا۔ سب نے مل کر اسے دیوچ رکھا تھا اور اچھی طرح رگید رہے تھے۔ وہ آزاد ہونے کی جتنی کوشش کرتا، پڑنے والے ہاتھوں میں اتنی ہی تیزی آجاتی اور عین اسی لمحے گلی کے دونوں جانب تیز سیٹیاں گونجنے لگیں۔

”پولیس۔“ قیصر نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”بھاگو۔“

”مگر ان میں سے کوئی بچ کر نہیں جاسکا۔ پولیس کے چند رہائیس جوان دونوں طرف موجود تھے۔ جلد ہی سب کو قابو میں کر کے بجلی کے کھمبے کی روشنی میں لایا گیا۔

”کون ہو تم لوگ؟“ ایک پولیس آفیسر نے جو اپنی وردی سے انسپکٹر نظر آ رہا تھا پوچھا۔

”ہم لوگ کالج اسٹوڈنٹس ہیں۔“ قیصر نے جواب دیا۔ ”فلم کا سیکنڈ شو دیکھ کر واپس آرہے تھے کہ اس گلی میں چند نامعلوم غنڈوں نے ہمارے ایک ساتھی شکیل پر حملہ کر دیا۔ ہم اسے بچانے کی کوشش کر رہے تھے کہ آپ لوگوں کی سیٹیاں سن کر غنڈے بھاگ گئے۔“

”کس طرف سے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔ ”گلی تو دونوں جانب سے ہم نے گھیر رکھی تھی۔“

”پتا نہیں۔“ قیصر نے کہا۔ ”ہم نے تو یہ ہی دیکھا کہ سیٹیوں کی آواز سننے ہی دو سب کے سب ہمیں چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔“

”تمہارے پاس سینما کے ٹکٹ کا آدھا حصہ تو ہوگا۔“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”کچھ ختم ہونے تک تھے مگر ہر نکل کر ہم نے وہیں پھینک دیئے۔“

”خوب۔“ انسپکٹر کا لہجہ بڑا طنزیہ تھا۔ وہ ایک کھائشیل کی طرف گھوما۔ ”دلاور خان ذرا اس غریب کو اٹھا کر لاؤ جس کی یہ لوگ مرمت کر رہے تھے۔“

”آپ پولیس انسپکٹر ہیں۔“ قیصر نے پوچھا۔

”میرا نام انسپکٹر نیاز احمد نیازی ہے۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔

”تو انسپکٹر صاحب آپ ذرا علیحدگی میں میری بات سن سکتے ہیں۔“ قیصر نے کہا۔

”ابھی نہیں۔“ انسپکٹر نیازی نے جواب دیا۔ ”میں پہلے اس شخص کی صورت دیکھنا چاہتا ہوں جس کے پیچھے تم لوگ پلس سینما سے لگے چلے آرہے تھے۔“

”جی۔“ قیصر نے چونک کر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

”جی۔“ انسپکٹر نیازی نے کہا۔ ”ہم آپ کی پوری سازش سے واقف ہیں۔“
 ”تہی دیر میں کانسٹیبل دلاور اس شخص کو سارا دیتا ہوا روشنی میں لے آیا۔“
 ”مجد۔“ قیصر ہی نہیں، مجیب اور دوسرے لڑکوں کے منہ سے بیک وقت انتہائی
 برت سے نکلا۔ ”مگر امجد اس وقت جواب دینے کی حالت میں نہیں تھا۔ اسے ان لوگوں
 نے کافی سے زیادہ مار لگائی تھی۔“

”سے فوراً اسپتال لے جاؤ۔“ انسپکٹر نیازی نے کانسٹیبل دلاور خان کو ہدایت کی اور
 پیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو آپ نے ٹھیکل کے دھوکے میں اپنے ہی ایک ساتھی کو
 بیٹ ڈالا۔ تشریف لے چلے آپ سے تو تھانے میں چل کر ذرا تفصیل سے بات ہوگی۔“
 ”انسپکٹر صاحب۔“ قیصر نے بڑی مشکل سے ایک ہاتھ اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے
 کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس معاملے کو ہمیں ختم کر دیا جائے ہم لوگ ہر طرح آپ کی
 خدمت کرنے کے لیے تیار ہیں۔“

”کیا خدمت۔“ انسپکٹر نیازی نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔
 ”مجیب۔“ قیصر نے کہا۔ ”ذرا دیکھو تو اس وقت کیا خدمت کی جاسکتی ہے۔“
 انسپکٹر نیازی کے اشارے پر مجیب کو چھوڑ دیا گیا۔ مجیب نے ایک چکر لگایا اور تقریباً
 ڈیڑھ سو روپے لاکر قیصر کے ہاتھ پر رکھ دیئے قیصر نے اپنے بٹوے سے سارے نوٹ نکال
 لیے۔“

”یہ لیجئے سر دست یہ پانچ سو روپے حاضر ہیں اگر یہ کافی نہ ہوں تو مزید جو کچھ فرمائیں
 گے کل پیش کر دیا جائے گا۔“

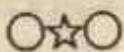
”میں اتفاق سے تمہارے والد صاحب کو نہ جانتا ہوتا تو یہ معاملہ اس طرح ختم نہیں
 ہو سکتا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”تم لوگ جاسکتے ہو مگر کل فائر بریگیڈ کے تھانے میں دو ہزار کی
 رقم پہنچ جانا چاہیے۔“

دوسرے لمحے تمام کانسٹیبل جو قیصر کو حملے کے وقت پندرہ بیس محسوس ہوئے تھے اور
 درحقیقت میں انسپکٹر سمیت صرف دس تھے ایک ہی ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

”یاریہ معاملہ اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔“ قیصر سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ”اول تو کیسی عجیب ہے کہ کلیل کی جگہ امجد کیسے آگیا۔ اس کے علاوہ میں نے پہلی مرتبہ کسی پولیس انسپکٹر کو اتنی جلدی رشوت لے کر بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”اور وہ بھی ٹیکسی میں۔“ مجیب نے کہا۔ ”کسیں ایسا تو نہیں کہ کلیل کی حجامت ہٹانے کی کوشش میں اپنی حجامت ہو گئی ہو۔“

”ممکن ہے قیصر کو اس وقت اس بات کا پوری طرح یقین نہ آیا ہو مگر دوسرے دن جب وہ فائر بریگیڈ کے پولیس اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں نیاز احمد نیازی نام کا کوئی انسپکٹر نہیں ہے تو اسے کچھ یقین آنے لگا۔ پھر جب اس نے اسپتال جا کر امجد سے ملاقات کی تو کوئی شبہ ہی نہیں رہ گیا کہ کسی نامعلوم طریقے پر کلیل کو اس کی سازش کا پہلے سے علم ہو چکا تھا اور اس نے بڑی چالاکی سے قیصر کا داؤ خود اس ہی پر الٹ دیا۔“ مرے پر سوار ہونے والی بات اسی دن شام کو ظاہر ہوئی۔ قیصر اس دن کالج نہیں گیا تھا۔ شام کو مجیب نے آگرتا کہ آج کلیل نے کالج کے غریب طلباء کے فنڈ میں پانچ سو روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔



کچر ختم ہوئی تو کلیل، شہناز اور پروین کے ساتھ سینما ہال سے باہر نکلا۔
”آپ کہاں رہتے ہیں کلیل صاحب۔“ شہناز نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے

پوچھا۔

”جہاں آپ رہتی ہیں۔“ کلیل نے یوں ہی کہہ دیا۔

”جی۔“

”جی وہ میرا مطلب ہے اسی شہر میں رہتا ہوں۔“ کلیل جلدی سے بولا۔ پروین ہنسنے

لگی۔

”ظاہر ہے جب آپ یہاں کے کالج میں پڑھتے ہیں تو کسی دوسرے شہر میں تو نہیں رہ

سکتے۔“

”شاید آپ بتانا نہیں چاہتے۔“ شہناز نے کار اشارت کی۔ پروین اور کلیل کچھیلی

سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ کلیل نے جواب دیا۔ ”در اصل بہت معمولی سی جگہ

ہے نا شرم آتی ہے بتاتے ہوئے۔“

”تو پھر میں آپ کو کہاں اتاروں۔“

”بس اپنی کوٹھی کے آس پاس ہی کہیں اتار دیں۔ میں وہاں سے پیدل چلا جاؤں گا۔“

”تم اپنے گھر جاؤ گی یا میرے ساتھ چلو گی۔“ شہناز نے پروین سے پوچھا۔

”بھئی مجھے تو گھر ہی پہنچا دو۔“ پروین نے جواب دیا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ شہناز نے کار پروین کے گھر کی طرف موڑ دی۔

پروین کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے گھر چھوڑ کر شہناز نے کار واپس موڑ دی۔

”آپ میری ایک بات مانیں گے۔“ کچھ دور جانے کے بعد شہناز نے کلیل سے کہا۔

وہ اب بھی کچھیلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

”یہ آج آپ ہر بات سچ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“ کلیل نے کہا۔ شہناز کچھ شرما گئی۔
 ”تو کیا آپ سچ بولنے سے ڈرتے ہیں۔“ اس نے بات بدلنا چاہی۔
 ”جی ہاں۔“ کلیل نے جواب دیا ”اور میرے خیال سے ہر شریف آدمی کو ڈرنا
 چاہیے۔“

”اچھا! وہ کیوں؟“ شہناز نے کچھ دلچسپی سے پوچھا۔
 ”اس لیے کہ سچ بولنے والوں کا انجام بخیر نہیں ہوتا۔ وہ آپ نے کسی فلسفی کا قول
 سنا۔ کسی سے سچ مت بول بولے گا تو تیرے آگے آئے گا۔“
 شہناز ہنسنے لگی۔

”آپ غالباً اسے مذاق سمجھ رہی ہیں۔“ کلیل نے کہا ”مگر میں باقاعدہ مثال دے کر
 بت کر سکتا ہوں۔“

”مگر پھر آپ ناراض ہو جائیں گی۔“

”نہیں ہوؤں گی۔“

”اچھا تو پھر اسے یوں سمجھئے کہ اگر میں کہوں کہ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ جی
 ہوتا ہے کہ..... جی چاہتا ہے کہ..... جی چاہتا ہے کہ..... بس آپ کو..... بالکل نہ دیکھوں
 اور آنکھیں بند کر لوں۔“

”جی۔“

”جی ہاں! اس لیے کہ دیکھوں گا تو آپ اور اچھی لگنے لگیں گی اور پھر پورا خطرہ ہے کہ
 اس وہ حادثہ نہ ہو جائے جو ہمارے فلموں میں عام طور پر اور عام زندگی میں کبھی کبھی ہوتا
 ہے۔ تو میرا یہ کہنا ایک سچی بات ہوگی مگر یہ بات منہ سے نکالنے کے بعد ظاہر ہے کہ آپ
 اس وقت کارروائی کر کہیں گی گیٹ آؤٹ۔“

”کون سا حادثہ۔“ شہناز نے اس طرح کہا جیسے باقی گفتگو اس نے سنی ہی نہ ہو۔

”جی۔“ کلیل چونکا۔ ”کیا اتر جاؤں۔“

”میں پوچھ رہی تھی کہ آپ کس حادثے کا ذکر کر رہے تھے۔“ شہناز نے بہت آہستہ سے کہا۔ ”اور یہ آپ سے اترنے کے لیے کس نے کہا تھا۔“

”اوہ تو آپ نے حادثے کے بارے میں پوچھا۔ مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے کہ رہی ہوں گیٹ آؤٹ۔“

”آپ کے والدین بھی کیا یہیں رہتے ہیں۔“ شہناز نے معلوم نہیں کس خیال کے تحت پوچھا۔

”تو اب آپ میرے والدین سے میری شکایت کریں گی۔“ ٹھیکل گھبرا کر بولا۔ ”دیکھیے میں نے کہا تھا کہ سچی بات کسی کو گوارا نہیں ہوتی۔“

”میں نے اس لیے نہیں پوچھا۔“ شہناز پھر مسکرائی۔ ”تو پھر؟“

”میں کہنے والی تھی کہ انہیں کسی دن ہمارے گھر لائیے گا۔“

”گویا آپ کو اتنی بڑی سچی بات بالکل ناگوار نہیں گزری۔“

”جی نہیں۔“

”تو... تو... میرا مطلب ہے تو... تو... میں... میں۔“

ٹھیکل ہکھلانے لگا۔

”آپ کا مطلب ہے تو تو میں میں۔“ شہناز بڑی میٹھی آواز میں ہنسی۔ ”یہ کیا بات ہوئی۔“

”جی... کچھ نہیں... بس آپ مجھے یہاں اتار دیجئے۔“ ٹھیکل نے کار کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ شہناز کی کوٹھی چند قدم کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔

”تو جی جی آپ کہیں قریب ہی رہتے ہیں۔“ شہناز نے کار روک دی۔

”تو جی جی میں کہیں قریب ہی رہتا ہوں۔“ ٹھیکل نے بالکل اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

”ویسے اسی مضمون پر کسی شاعر نے بڑا اچھا شعر کہا ہے۔ سناؤں؟“

”سنائیے۔“

”عرض کیا ہے۔ جو دیکھیے تو رگ جاں سے بھی قریب مگر جوڑھوٹے تو کوئی عمر بھر
ہیں ملتا۔“

”بہت خوب۔ آپ کا شعر ہے؟“

”جی ہاں آپ ہی کا ہے۔“

”یعنی سچ سچ آپ کا ہے؟“

یہ میں نے کب کہا۔ ”کھیل مسکرا دیا۔“ ویسے خطرہ ضرور ہے کہ حالات یہی رہے تو
مگر بھی بن جاؤں گا اور دوسرا خطرہ یہ ہے کہ سچ سچ آپ کا تکیہ کلام نہ بن جائے۔“

”ایک بات اور مانیں گے آپ میری۔“

”کیا ساری باتیں آج ہی منوالیں گی۔“ کھیل نے شرارت سے کہا۔

”بہر حال فرمائیے۔“

”آپ مجھے آپ نہ کہا کریں۔“

”پھر کیا کہوں؟“

”تم۔“

”کوئی وجہ؟“

”مجھے ”آپ“ سے شرم آتی ہے۔“

”اور مجھے ”تم“ سے اس سے زیادہ شرم آتی ہے۔“

”میں ”آپ“ کو پسند نہیں کرتی۔“

”اور میں ”تم“ کو۔“

”دیکھیے مجھے۔ میں ”آپ“ کو بالکل اچھا نہیں سمجھتی۔“ شہناز کچھ بے بسی سے بولی۔

”اور میں ”تم“ کو۔“ کھیل نے شرر لہجے میں جواب دیا۔

”مجھے ”آپ“ سے نفرت ہے۔“

”اور مجھے ”تم“ سے۔“ کھیل نے بڑے مزے سے جواب دیا۔ دونوں نے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا اور ہنس دیے۔

کلیل نے کار کا دروازہ کھولا اور باہر اتر گیا۔

”تو پھر آپ کل آرہے ہیں؟“

”اگر آپ نے بلایا تو ضرور۔“

”پھر وہی آپ؟“ شہناز نے ٹوکا۔

”جی ہاں پھر وہی میں۔“ کلیل ہنسنے لگا۔ ”اچھا باقی باتیں کل ہوں گی۔“

”خدا حافظ“

”خدا حافظ۔“

کلیل نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور تیز تیز قدموں سے ایک طرف چل دیا۔ شہناز چند لمحوں سے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور پھر اپنی کونٹھ کی طرف بڑھ گئی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا، اسے ہارن نہیں بجانا پڑا۔ اس نے کار گیرج میں کھڑی کی اور دروازہ بند کیا۔ گیٹ کی کنڈی لگائی اور اپنے کمرے کی طرف جارہی تھی کہ اچانک اس کی نظر کونٹھ کے عقبی حصے کی جانب اٹھ گئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کوئی ابھی ابھی اس کے سامنے احاطے کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا تھا۔ شہناز نے جلدی سے ایک ستون کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ اس تاریکی میں اور اتنے فاصلے سے کودنے والے کے خدو خال دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ شہناز نے دیکھا کہ وہ سامنے آنے کے بجائے کونٹھ کے پیچھے ہی پیچھے اس کے ابو کے کمرے کی طرف جارہا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ جا کر ابو کو ہوشیار کرے یا پہلے پولیس کو فون کر دے، اس نے عدنان کے کمرے کی بجلی روشن ہوتے دیکھی۔

”یہ کوئی چور ہے۔“ اس نے دل میں سوچا یا خود عدنان صاحب ہی چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے ہیں۔

”شہناز نے فیصلہ کیا کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اسے عدنان کے کمرے میں جھانک کر دیکھ لیتا چاہیے۔ وہ دبے پاؤں اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے کی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اور ایک بند تھا۔ اس نے بند پٹ کی آڑ میں ہوتے ہوئے پردے کو ذرا سا ہٹایا۔

اور اگر اس نے فوراً ہی اپنے منہ پر ہاتھ نہ رکھ لیا ہوتا تو ضرور کوئی کلمہ حیرت نکل جاتا کیونکہ اس کی نظریں کمرے میں جس شخص کو دیکھ رہی تھیں، وہ کوئی چور تھا نہ عدنان بلکہ..... ہکلیل تھا۔ شہناز کے دیکھتے دیکھتے اس نے پہلے اپنے سر سے بالوں کی ایک وگ اتاری اور پھر آئینے کے سامنے اپنی آنکھوں کو کچھ دیر ملتا رہا اور پھر جب اس نے کھڑکی کی طرف رخ کیا تو شہناز کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ تو ہکلیل نہیں عدنان تھا۔ اب نہ ہکلیل کی طرح اس کے سر پر لمبے لمبے بال تھے اور نہ اس کے چہرے پر بھوری آنکھیں۔ اب اس کے بال بھی گھونگھریالے تھے اور آنکھیں بھی ہلکی ہلکی نیلی جیسے کسی پرسکون جھیل کی ٹھہری ہوئی سطح البتہ اس کے جسم پر سوٹ وہی تھا جو ہکلیل نے پہن رکھا تھا۔ مگر جلد ہی یہ بھی اتر گیا۔

شہناز کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا اٹھ گیا وہ سیدھی اپنے کمرے میں آکر یونہی لباس تبدیل کیے بغیر یٹنگ پر گر گئی۔ اسے عدنان کے اس فریب پر بے حد غصہ آ رہا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ جیسے جیسے اس کی باتیں اور گزرے ہوئے لمحات یاد آتے گئے شہناز کا غصہ اس کی جھنجھلاہٹ کہیں دور اڑتے ہوئے بادلوں کی طرح غائب ہوتی چلی گئی۔ پتا نہیں کب وہ اسی طرح سوچتے سوچتے سو گئی مگر اس کے ہونٹوں پر ایک دبی دبی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔



دوسرے دن کالج میں ایک ہنگامہ ساچ گیا۔ کھیل کی کاپلٹ کی خبر ایسی نہیں تھی جو کسی ہنگامے کے بغیر گزر جاتی۔ سب سے پہلے اسے مجیب نے گیٹ سے اندر آتے دیکھا۔ بہترین تراش کا سوٹ جو اس کے سڈول جسم پر اتنی خوبصورتی سے فٹ تھا کہ نگاہوں میں کھب جاتا تھا اور پھر اس سے زیادہ یہ کہ چشمہ عائب۔

”آپ کی تعریف۔“ مجیب نے آگے بڑھ کر بڑے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”اپنے استاد کو نہیں پہچانتے برخوردار۔“ کھیل نے پلٹ کر جواب دیا۔

”وہ! استاد جی۔“ مجیب نے جلدی سے کہا۔ اس کے ساتھ دو تین لڑکے اور بھی موجود تھے۔ ”مگر آپ اس وقت کیسے؟ مجھے کا انتظام تو ہم نے آج رات کے لیے کیا تھا۔“

لڑکوں نے ایک قہقہہ لگایا۔

”بات یہ ہے صاحبزادے کہ کل رات اس کالج کے کچھ لڑکے تمہارے ہمیشہ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ بغیر پیسے دیئے بھاگ آئے ہیں۔ وہی وصول کرنے آیا ہوں۔“ کھیل نے بڑے مزے سے جواب دیا۔

ایک سناٹا سا چھا گیا۔ لڑکے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ مجیب کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کالج میں اس کا اچھا خاصا رعب تھا اور پھر قیصر کی دوستی نے اسے کچھ اور بھی مغرور بنا دیا تھا۔

”تمہاری یہ ہمت۔“ وہ دانت پیستے ہوئے آگے بڑھا۔ پوری طاقت سے ایک گھونسا کھیل کے منہ پر مارنا چاہا۔

کھیل نے بڑے اطمینان سے ہاتھ اٹھا کر اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے لی۔ مجیب نے دوسرا ہاتھ چلایا۔ وہ کھیل کی دوسری مٹھی میں آگیا۔ مجیب نے دونوں ہاتھ چھڑانے کے لیے ایک زبردست جھٹکا دیا مگر خود ہی جھول کر رہ گیا اور پھر لڑکوں نے دیکھا کہ اس کے

ہرے پر شدید تکلیف کے تاثرات پیدا ہوئے۔ چہرہ سفید پڑنے لگا ماتھے پر پسینے کی بوندیں
 پھر آئیں۔ کھلیل کی گرفت کچھ اتنی ہی سخت تھی کہ اسے اپنی کھالیاں ٹوٹی محسوس ہونے
 لگیں اور وہ تکلیف سے بے چین ہو کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ یہ صورت حال بمشکل ایک
 منٹ رہی ہوگی مگر اتنی ہی دیر میں عجیب چپیں بول گیا تھا۔

کھلیل نے ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر اسے چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گیا عجیب کے اندر اٹھنے
 کی بھی طاقت نہیں رہ گئی تھی۔ لڑکے کھلیل کو حیرت سے جاتے ہوئے دیکھتے رہنے کے
 علاوہ اور کچھ نہیں کر سکے۔ جس کھلیل کو انہوں نے اس وقت دیکھا تھا وہ ان کے لیے بالکل
 عجیب تھا۔

جلد ہی یہ حیرت ناک خبر پورے کلاس میں پھیل گئی اور اس کا فائدہ اتنا ضرور ہوا کہ پھر
 کسی نے کھلیل کا مذاق اڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اردو کے پیریڈ کے بعد اگلا گھنٹا خالی تھا۔
 کھلیل حسب عادت پارک کی اس مخصوص بچ کی طرف روانہ ہو گیا۔ چند منٹ بعد شہناز
 بھی آگئی۔

”دیکھ لو میں نے وہ تمام وعدے پورے کر دیئے ہیں جو تم سے کل رات کیے تھے۔“
 کھلیل نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”بہت بہت شکریہ۔“ شہناز نے اس کی طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے
 کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ کھلیل نے جواب دیا اور یہ تم میری طرف اس طرح کیا دیکھ رہی
 ہو۔“

”کچھ نہیں۔“ شہناز نے جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”میں یہاں اکیلا آیا تھا۔“ کھلیل نے بتایا۔ ”میرے والدین مرشد آباد میں رہتے ہیں
 میں نے انہیں جلد سے جلد یہاں پہنچنے کے لیے تار دے دیے۔“

”وہ کیوں؟“ شہناز پوچھا۔

”کمال ہے کل رات ہی تو تم نے کہا تھا کہ میں اپنے والدین کو تمہارے گھر لے کر

اؤں۔ ”کلیل نے کچھ حیرت سے کہا۔

”اوہ۔ مگر اس کے لیے انہیں تار دینے کی کیا ضرورت تھی۔“ شہناز نے بالکل سپاہ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا پھر میرا خیال تھا کہ وہ یہاں آپ کے ساتھ رہتے ہوں گے۔ آپ نے تار بلا وجہ دیا۔“

”بلا وجہ نہیں دیا۔“ کلیل مسکرایا۔ ”ایک بہت ہی خاص وجہ سے دیا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”کیا تم نہیں جانتیں۔“

”بھلا مجھے آپ کے دل کی بات کیسے معلوم ہو سکتی ہے؟“

”دل کو دل سے راہ ہو تو ہو سکتی ہے۔“

”گویا دل نہ ہوا پبلک ور کس ڈیپارٹمنٹ ہو گیا جو جگہ جگہ سڑکیں کھودا رہتا ہے۔“

”میں سمجھ گیا۔“ کلیل مسکرایا۔ ”تم میری ہی زبان سے سنتا چاہتی ہو۔“

”کیا؟“

”یہی کہ میں نے اپنے والدین کو تار دے کر کیوں بلایا ہے۔“

”آپ بتانا ہی چاہتے ہیں تو بتادیں۔“

”میں نے انہیں اس لیے بلایا ہے کہ وہ تمہارے ابو اور امی سے مل کر تمہیں میرے لیے مانگ سکیں۔“ آخر کلیل نے کہہ ہی دیا۔

”کلیل صاحب۔“ شہناز نے کچھ تیزی سے کہا۔

”ہاں! شہناز۔ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ کلیل نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ شاید اس نے شہناز کے لہجے پر غور نہیں کیا تھا۔

”کلیل صاحب! شہناز پھر بولی۔ ”یہ بات تنہا آپ کیسے طے کر سکتے ہیں۔“

”اسی لیے تو میں نے اپنے والدین کو بلایا ہے۔“

”مگر آپ یہ حقیقت مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں کہ اس مسئلہ کا تعلق کچھ میری ذات سے بھی ہے۔“

”لیکن ہمارے درمیان تو یہ بات طے پا چکی ہے۔“ فکیل نے حیرت سے شہناز کی طرف دیکھا۔

”اچھا۔ یہ کب۔“ شہناز کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

”کل رات۔“ فکیل نے بتایا۔ ”بے شک کھلے کھلے الفاظ میں ہم دونوں نے کوئی بات نہیں کی تھی مگر وہ گفتگو میں ڈھکے چھپے کنارے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا انداز۔ وہ تیز تیز دھڑکنیں۔ وہ تمہارا شرمناک وغیرہ وغیرہ کیا یہ سب اس بات کے اشارات نہیں تھے کہ۔۔۔۔۔“

”آپ کو اشارات کی زبان سمجھنے کا ملکہ کب سے حاصل ہو گیا۔“ شہناز نے بات کاٹی۔

”گویا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔“ فکیل نے غور سے شہناز کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تھوڑی سی دلچسپی دوستانہ تعلقات اور ان ہی تعلقات کی بنا پر معمولی سی پسندیدگی کو آپ محبت تو نہیں کہہ سکتے۔“ شہناز دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے افسوس ہوا کہ آپ بھی ان عام نوجوانوں سے کچھ مختلف ثابت نہیں ہوئے جو لڑکیوں کی ذرا سی بے تکلفی کو بھی مشوئی زہر عشق کا پہلا باب سمجھنے لگتے ہیں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو شہناز۔“ فکیل نے شدید حیرت سے کہا۔ ”تو کیا جو کچھ میں نے سمجھا تھا غلط تھا۔“

”میں آپ کی سوچ کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں کیا بتا سکتی ہوں۔“

”تو تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔“

”بالکل نہیں۔“ شہناز نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”آپ ہوں یا کوئی اور میں زندگی کے اتنے اہم مسئلہ پر کسی کی بالادستی تسلیم نہیں کر سکتی۔ میں اس کی قائل نہیں کہ چونکہ آپ مجھ پر جان دیتے ہیں اس لیے لازمی ہے کہ مجھے بھی آپ کی محبت کا دم بھرنا چاہیے۔ یہ تو اپنی پسند کا سودا ہوتا ہے فکیل صاحب۔“

”مگر۔۔۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بہت زیادہ محبت۔“

کرتے رہیے۔ میں نے منع تو نہیں کیا۔
 ”مگر میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔“
 ”تو مت کیجئے، یوں بھی تصور صرف مصور اور شاعر ہی کے کام کی چیز ہوتا ہے اور آپ
 شاعر ہیں نہ مصور۔“

”تم مجھے نہیں ملیں تو میں مری جاؤں گا۔“
 ”اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر۔ ساتھ میں یہ بھی تو کہئے۔“ شہناز کے لہجے سے یہ اندازہ کرنا
 دشوار تھا کہ یہ اس نے طنز کیا ہے یا مذاق؟“
 ”میں زہر کھالوں گا، خود کشی کر لوں گا۔“ شکیل جوش سے بولا۔
 ”سب یہی کہتے ہیں گر آج تک کسی کو مرتے نہیں دیکھا۔“
 ”تو تم سمجھتی ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“
 ”سچ سچ آپ اس وقت بڑے اچھے ڈاگ بول رہے ہیں۔“
 ”یہ بات ہے۔“ شکیل کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ”تو پھر میں تمہیں مر کے بھی دکھا دوں
 گا۔“

”کب تک؟“ شہناز بچ سے کھڑی ہو گئی۔
 ”بس زہر ملنے کی دیر ہے۔“
 ”اچھی بات ہے۔ میں انتظام کر دوں گی۔“ شہناز نے کہا اور تیز قدموں سے چلتی
 ہوئی لائبریری کی طرف بڑھ گئی۔

”شکیل اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے یوں دھم
 سے بچ پر بیٹھ گیا جیسے اس کے پیروں میں جسم کا بوجھ سنبھالنے کی طاقت نہ رہی ہو۔ اچانک
 ہی قریب کے پودوں کو جنبش ہوئی اور قیصر مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ آہٹ سن کر
 شکیل نے سر اٹھایا تو قیصر حد درجہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔
 ”تم۔۔۔ تم۔۔۔ یہاں کیوں آئے ہو؟“ شکیل نے غصے سے کہا۔

”میں نے سب کچھ سن لیا ہے شکیل صاحب اور مجھے آپ سے بے حد ہمدردی

ہے۔“ قیصر نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ آپ تو اس مغرور لڑکی کی فطرت سے اب واقف ہوئے ہیں مگر میں بہت پہلے اس کا اصل روپ دیکھ چکا ہوں۔ اس کی عادت ہے کہ پہلے ہر نوجوان کو اسی طرح محبت کا فریب دیتی ہے اور پھر جب اس کا اپنا دل اس کھیل سے بھر جاتا ہے تو ٹھوکر مار دیتی ہے۔“

”مگر میں اس کے باوجود شہناز سے محبت کرتا ہوں۔ تم اسے میرے سامنے برا نہیں کہہ سکتے۔“ ٹھکیل نے تیزی سے جواب دیا۔

”واقعی آپ بہت بلند انسان ہیں۔“ قیصر نے داد دی۔ ”مجھے ندامت ہے کہ میں پہلے آپ کو نہیں سمجھ سکا۔ میں نے آپ کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے آپ مجھے اپنا رقیب خیال کرتے ہوں گے اور میں بے شک تھا بھی مگر یقین کیجئے کہ اب اگر شہناز آپ کی بن جائے تو مجھے اس سے زیادہ خوشی کسی اور بات سے نہیں ہوگی۔“

”مگر وہ میری نہیں بن سکتی۔“ ٹھکیل نے افسردگی سے کہا۔ ”تم نے سن لیا ہو گا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔“

”جی ہاں۔ میں سن چکا ہوں اور اسی لیے میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ اسے بھول جائیے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ ٹھکیل نے جوش کے ساتھ کہا۔ ”میں اسے نہیں بھول سکتا۔ میں اس کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ میں سچ مچ زہر کھا کر مرجاؤں گا۔“ اس نے ایک دم قیصر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اگر تمہیں واقعی مجھ سے ہمدردی ہے تو مجھے کہیں سے بھی تھوڑا سا زہر لادو، میں اسے دکھا دیتا چاہتا ہوں کہ ابھی دنیا ایسے باوقالوگوں سے خالی نہیں ہوئی جو محبت میں ہنستے ہنستے اپنی جان دے دیتے ہیں۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ محبوب کی بے وفائی کے بعد آدمی کو واقعی مر ہی جانا چاہیے۔“ قیصر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”محبت کی زندہ جاوید داستانیں آپ جیسے عاشقوں کے خون سے ہی لکھی جاتی ہیں۔ آپ مرجائیں گے مگر زمانہ آپ کی اس قربانی کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔ آپ جیسے عاشق صادق کی مشکل آسان کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں

ضرور آپ کو زہر لا دوں گا۔“

”شکریہ۔ دوست۔“ کلیل نے بڑی گرم جوشی سے کہا۔ ”میں صرف اتنا خود غرض نہیں ہوں کہ ساری شہرت اور نیک نامی صرف اپنے ہی حصے میں سمیٹ لوں۔ تم بھی اس بات ہرجائی کے ستائے ہوئے ہو۔ تم بھی اس بے وفا کے ٹھکرائے ہوئے ہو۔ میں تھوڑا سا زہر تمہیں بھی دے دوں گا اور پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ زندہ جاوید ہو جائیں گے۔“

”ارے نہیں کلیل صاحب۔“ قیصر جلدی سے بولا۔ ”میں بہت بزدل آدمی ہوں۔ آپ جیسا حوصلہ کہاں سے لاؤں گا۔ میرے لیے یہی سعادت کافی ہے کہ آپ میرے ہاتھوں اپنی مراد کو پہنچ جائیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آج شام سے پہلے پہلے آپ کو کسی بھی طرح خواب آور دوا کی گولیاں لا دوں۔ بس رات کو دس پانچ گولیاں پانی کے ساتھ کھا کر سو جائیے گا۔ خدا نے چاہا تو حشر سے پہلے آنکھ نہیں کھلے گی۔“

”میں تمام زندگی تمہارا احسان مند رہوں گا دوست۔“ کلیل نے بڑے خلوص سے

جواب دیا۔



شہناز بڑی دیر سے اپنی امی کے کمرے میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ بیگم شاکر ایک آرام کرسی پر اطمینان سے ٹیک لگائے کچھ بننے میں مصروف تھیں مگر کبھی کبھی نگاہ اٹھا کر اسے بھی دیکھتی جا رہی تھیں۔

”کیا سوچ رہی ہو بیٹی؟“ آخر انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

”امی ایک بات پوچھوں؟“

”ضرور پوچھو۔“

”یہ عدنان صاحب آخر یہاں کیوں آئے ہیں؟“ شہناز نے رکتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر ان کا قیام اس شہر میں مستقل ہے تو کہیں الگ مکان لے کر کیوں نہیں رہتے اور عارضی ہے تو پھر ہم سب سے اتنے الگ تھلگ کیوں رہتے ہیں۔“

”وہ تو الگ تھلگ نہیں رہتا۔ مجھ سے اور تمہارے ابو سے روزانہ گھنٹوں باتیں کرتا رہتا ہے۔“ بیگم شاکر نے جواب دیا۔ ”یہ تو تم نے ہی ایک طرح سے اس کا بایکاٹ کر رکھا ہے۔ وہ بھی دل میں کیا سوچتا ہو گا۔“

”آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آخر عدنان صاحب یہاں کیوں آئے ہیں؟“

”اب کیا بتاؤں بیٹی۔ تم نے کبھی اس میں دلچسپی لی ہوتی تو میں بتاتی بھی۔“

”میں سمجھی نہیں امی۔“

”بیٹی۔“ بیگم شاکر ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ ”اب تم خدا کے فضل سے جوان ہو اور لڑکیاں جب جوان ہو جائیں تو وہ ماں باپ سے زیادہ شوہر کے گھر اچھی لگتی ہیں۔ تمہارا بی اے کا آخری سال ہے۔ تمہارے ابو چاہتے ہیں کہ بی اے پاس کرتے ہی تمہاری شادی کر دی جائے۔“

”تمہارے ابو کے دوست عرفان صاحب نے اپنے بیٹے عدنان کا پیغام دیا تھا اور تمہاری خالہ چاہتی ہیں کہ قیصر کے ساتھ تمہاری شادی کر دی جائے۔ لڑکے دونوں گھر کے

اور جانے پہچانے ہیں مگر میری اور تمہارے ابو دونوں کی رائے عدنان کے حق میں ہے۔ وہ خود بھی تمہیں دیکھنا اور سمجھنا چاہتا تھا اسی لیے تمہارے ابو نے اسے یہاں بلایا تھا۔ مگر ہم تمہاری شادی کا فیصلہ تمہاری پسند کے خلاف نہیں کرنا چاہتے۔ میں نے محسوس کیا کہ تمہاری توجہ عدنان سے زیادہ قیصر کی طرف ہے چنانچہ میں نے تمہارے ابو سے کہہ دیا ہے۔ عدنان آج کل میں یہاں سے چلا جائے گا۔“

”میں نے کبھی قیصر بھائی کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا امی۔“ شہناز نے سر جھکا کر کہا۔
”کیا میں اس کا مطلب یہ سمجھوں کہ تم عدنان کو پسند کرتی ہو۔“

”امی یہ معاملہ بے شک میری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ شہناز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مگر اتنی آزادی کے باوجود میں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ آپ میرے لیے غلط فیصلہ کر سکتی ہیں۔ کوئی لاکھ تاویلیں دے مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ والدین ان معاملات میں اپنے بچوں سے زیادہ تجربے کار اور فہمیدہ ہوتے ہیں۔ شادی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم ترین فیصلہ ہے۔ اس کے لیے جس دور رس اور غیر جذباتی نگاہ و ذہن کی ضرورت ہوتی ہے وہ نا تجربے کار اولاد کے پاس نہیں تجربے کار والدین کے پاس ہوتا ہے۔ بچوں کی پسندیدگی کا خیال رکھنا اچھی بات ہے مگر میرا ایمان ہے والدین کی مرضی کے فیصلے مبارک ہوتے ہیں۔“

”خوش رہو بیٹی۔“ بیگم شاکر بھرائی ہوئی آواز سے بولیں۔ ”مجھے تم سے یہی توقع تھی۔ تو پھر میں تمہارے ابو سے عدنان کے لیے کہہ دوں۔“

”اب میں اس کا جواب کیا دوں امی۔“ شہناز شرما گئی۔ ”میں کہہ چکی ہوں مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔“

یہ کہہ کر وہ جلدی سے کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ بیگم شاکر نے ساری کے آنچل سے اپنی نم آنکھیں خشک کیں اور پھر آپ ہی آپ مسکراتے ہوئے دوبارہ بننے میں مصروف ہو گئیں۔

شہناز باہر نکلی تو اس کا رخ اپنے کمرے کے بجائے عدنان کے کمرے کی جانب تھا اس

نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ عدنان بڑا افسردہ اور بجھا بجھا سا کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں ایک کتاب رکھی تھی جس کے ورق پتھکے کی ہوا سے ادھر ادھر الٹ رہے تھے۔ آہٹ سن کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔

”اوہ آپ!“ وہ کچھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”جی ہاں! میں۔“ شہناز نے کہا۔ ”تشریف لاسکتی ہوں۔“

”ضرور لائیے۔ میں بھلا آپ کو کیسے منع کر سکتا ہوں۔“

”کیا بات ہے۔“ شہناز نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ ”آج تو بالکل شریف آدمیوں کی طرح گفتگو کر رہے ہیں۔“

”آپ جیسے شریف لوگوں کے ساتھ رہنے کا اتنا اثر تو ہونا ہی چاہیے تھا۔“

”تو مانتے ہیں کہ کچھ سیکھنے کی ضرورت مجھے نہیں آپ کو تھی۔“

”جی ہاں۔ انسان کچھ کھو کر ہی سیکھتا ہے۔“

”آپ کے چہرے پر جس انداز سے بارہنج رہے ہیں اسے دیکھ کر تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کچھ نہیں بہت کچھ کھو چکے ہیں۔“

”آپ نے سچ کہا میں بہت کچھ کھو چکا ہوں۔“ عدنان نے اسی افسردگی کے ساتھ

جواب دیا۔

”کوئی بہت قیمتی چیز تھی۔“

”جی ہاں۔ بہت قیمتی۔“ عدنان نے ایک گہری سانس لی۔

”ٹھنڈی سانس تو آپ نے اس طرح بھری جیسے۔“ شہناز رک کر مسکرائی۔ ”جیسے

نصیب دشمنان آپ کو کسی سے محبت ہو گئی ہو۔“

”یہی بات ہے۔“ عدنان آہستہ سے بولا۔

”ایں۔“ شہناز شرارت سے اچھل پڑی۔ ”یعنی یہ منہ اور مسور کی دال۔ میرا

مطلب ہے آپ اور محبت! اس بد نصیب لڑکی کی قسمت پھوٹی ہے۔ کچھ بتائیں گے۔“

”جی نہیں۔“

”اچھا یہی بتا دیجئے کہ وہ بھی آپ سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔“ شہناز بولی۔ ”ویسے کوئی لڑکی اتنی احمق ہو سکتی ہے اس میں مجھے شبہ ہے۔“

عدنان نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”اچھا وہ خوبصورت تو بہت ہوگی۔“ شہناز نے خود ہی کہا۔

”میں خوبصورتی کی زیادہ پروا نہیں کرتا۔“ عدنان نے جواب دیا۔

”گھر کا کام کاج کر لیتی ہے۔“

”ہاں! کچھ تو کر ہی لیتی ہے۔“

”پڑھی لکھی بھی ہوگی۔“

”بس واجبی حد تک۔“

”میں سمجھ گئی آپ گلشن کی بات کر رہے ہیں نا۔“ شہناز نے اس طرح کہا جیسے مشکل پسلی بوجھ لی ہو۔

”جی ہاں! اس گلشن کی جوا جڑ گیا۔“ عدنان نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”آپ کو سن کر خوشی ہوگی کہ میں کل واپس جا رہا ہوں۔“

”کل۔“ شہناز نے بھی ایک گہری سانس بھری۔ ”کل کس نے دیکھی ہے۔ آپ آج نہیں جاسکتے کیا۔“

”ٹرین کا وقت نہ گزر گیا ہوتا تو آج ہی چلا جاتا۔“

”تو کیا ہوا۔ پیدل چلے جائیں۔“

”اچھی بات ہے۔“ عدنان کھڑا ہو گیا۔ ”اس نے میز پر سے اپنے برف کیس کو اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔“

شہناز شام کے آٹھ بجے پروین سے مل کر واپس آئی۔ کار کو ٹھی کے گیٹ میں موڑ رہی تھی کہ ہیڈلائٹس کی روشنی ٹھیکل پر پڑی۔ وہ آہنی دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ شہناز نے فوراً بریک مار دیئے۔

”آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں۔“ اس نے کار سے اترتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ ”اس پروگرام کا کیا رہا۔“

”یہ دیکھو خواب آور دوا کی گولیاں۔“ ٹھیکل نے جیب سے ایک شیشی نکال کر دکھائی۔ ”میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بات سے بھر جاتے ہیں۔ مرنے کا وعدہ کیا ہے تو مر کر بھی دکھا دوں گا۔“

گیٹ سے کچھ فاصلے پر فٹ پاتھ پر لگے ہوئے ایک درخت کی آڑ میں چھپے ہوئے قیصر نے بھی یہ منظر دیکھا۔ وہ اپنے جاننے والے ایک کیمسٹ کی دکان سے ٹھیکل کو خواب آور دوا کی گولیاں خرید کر دینے کے بعد بظاہر اس سے رخصت ہونے کے باوجود بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک چلا آیا تھا۔

”یہ خواب آور دوا کی گولیاں ہیں یا محض شکر کی۔“ شہناز نے کہا۔ ”ذرا شیشی تو دکھائیے۔“

”تم جس طرح چاہو اپنا اطمینان کر سکتی ہو۔“ ٹھیکل نے شیشی اس کے ہاتھ میں دے دی۔ ”یوں یقین نہ آئے تو دس پانچ گولیاں کھا کر دیکھ لو۔“

شہناز نے شیشی کا لیبل پڑھنے کے لیے اسے ہیڈلائٹس کی روشنی میں دیکھا۔ ایک دم اچھل پڑی۔

”ارے۔“ اس کے منہ سے نکلا اور وہ جھک کر نیچے زمین پر دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا؟“ ٹھیکل نے پوچھا۔

”شیشی گر گئی۔“ شہناز نے دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں شیشی چھپاتے ہوئے کہا۔

”شاید کار کے نیچے چلی گئی ہے۔“
 ”تم ذرا اس طرف ہٹو میں دیکھتا ہوں۔“ کلیل نے کہا اور جھک کر کار کے نیچے دیکھنے لگا۔

”شہناز پیچھے ہٹ کر کار کے کھلے ہوئے دروازے کے قریب آگئی۔ جیسے ہی کلیل نے شیشی کی تلاش شروع کی۔ شہناز نے ہاتھ برہا کر اگلی سیٹ پر رکھا ہوا بیگ اٹھایا اور اسے کھول کر ہاتھ اندر ڈالا اور ایک دوسری شیشی نکالی۔ کلیل کی لائی ہوئی شیشی کا ڈھکنا کھول کر اسے بیگ میں الٹ دیا اور اپنی شیشی کی تمام گولیاں نکال کر کلیل کی شیشی میں ڈال دیں اور ڈھکنا بند کر دیا۔

”تو یہ بات ہے۔“ درخت کی آڑ میں کھڑے ہوئے قیصر نے دل میں کہا۔ ”صاحبزادی خود بھی اس جو کر پر لٹو ہیں۔ اس کا مرنا گوارا نہیں۔ خوب آوروں کی گولیاں رکھ دیں ہیں۔ کوئی بات نہیں اس کا علاج بھی ہو جائے گا۔“

شہناز بیگ بند کر کے سیٹ پر رکھ ہی رہی تھی کہ کلیل کھڑا ہو گیا۔
 ”یہاں تو کہیں نہیں ہے۔“ اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔
 ”رہنے دیجئے۔ مجھے مل گئی ہے۔“ شہناز نے بتایا۔
 ”کہاں ملی۔“

”اس طرف لڑھک کر آگئی تھی۔“ شہناز نے جواب دیا۔ ”یہ لیجئے۔“
 ”شیشی مل گئی تھی اس کے باوجود تم نے مجھے نہیں بتایا۔“ کلیل نے اس کے ہاتھ سے شیشی لے لی۔

”کیوں بتاتی۔ پریشان آپ ہو رہے تھے یا میں؟“
 ”تو تم مجھے پریشان کر کے خوش ہوتی ہو۔“ کلیل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
 ”واقعی اب مجھے مر ہی جانا چاہیے۔“

”ارے آپ بھلا کیا مریں گے۔“ شہناز نے جیسے منہ چڑایا۔ ”بس مجھے دکھانے کے لیے شیشی خرید لی ہے۔ مرنا ہوتا تو یہاں کیوں آتے، سوچا ہو گا شاید مجھے شیشی دیکھ کر رحم

گئے گا۔ میں جھوٹوں منع کروں اور آپ سچ سچ مرنے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔
 ”میں ہرگز اس خیال سے نہیں آیا تھا۔“ کھلیل نے بڑے غصے سے کہا۔
 ”پھر کیوں آئے تھے؟“

”یہ پوچھنے آیا تھا کہ میں تو خیر مر ہی جاؤں گا لیکن مجھے اتنا تو بتاؤ کہ میں نے تمہیں
 غلطی میں غلطی کی ہے اور تمہیں سچ سچ مجھ سے اتنی سی بھی محبت نہیں یا پھر کوئی اور ایسی
 بات ہو گئی ہے کہ تم نے مجھ سے یونہی نگاہیں پھیر لی ہیں۔“
 ”سچ سچ پوچھنا چاہتے ہیں یا جھوٹ موٹ۔“ شہناز نے بڑی اداسے سر نکاتے ہوئے

”جوابات بھی ہو سچ سچ بتاؤ پھر میں اطمینان سے جان دے سکوں گا۔“
 ”بات یہ ہے کہ امی جان میری شادی اپنے بھانجے قیصر سے کرنا چاہتی ہیں۔“ شہناز
 نے بدستور سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ کل رات سینما سے واپسی کے وقت مجھے کچھ
 غلطی سا شبہ ہوا کہ میں جیسے آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔ اگر یہ قیصر صاحب کا معاملہ سچ
 نہ آجاتا اور میری شادی آپ سے ہو جاتی تو شاید میں آپ سے سچ سچ محبت کرنے لگتی مگر
 آپ کے جانے کے بعد امی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر خوب ڈانٹا اور بتایا کہ وہ میری
 بڑی قیصر صاحب سے ملے کر چکی ہیں اور یہ کہ اب میں دوبارہ آپ کے ساتھ نظر آئی تو
 مال کھینچ لیں گی۔ آپ جاننے اپنی کھال شوق سے کون کھنچو اتا ہے، میں نے بھی دل میں
 کہا کہ لعنت بھیجو کھلیل صاحب پر، میرے لیے تو جیسے وہ ویسے قیصر صاحب۔ کیا فرق پڑتا
 ہے۔ میں ویسے بھی مشرقی لڑکی ہوں اور یہ بڑی پرانی روایت چلی آرہی ہے کہ مشرقی لڑکیاں
 ت خواہ کسی سے کریں مگر شادی اسی سے کرتی ہیں جس سے ماں باپ چاہتے ہیں۔“

”تو یہ بات ہے۔“ کھلیل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”محبت ایک مرتبہ پھر ظالم
 سچ کے ہاتھوں شکست کھا رہی ہے۔ اچھا خدا حافظ! کل تمہارا دل چاہے تو شام کے کسی
 بار میں پڑھ لینا کہ ایک ناکام محبت کرنے والا سنگ دل رسم و رواج کی قربان گاہ پر قربان
 کیا۔“

یہ کہہ کر ٹکیل سر جھکائے تھکے تھکے بو جھل قدموں سے سڑک کی جانب گھوم گیا۔ شہناز کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر واپس کار میں آ بیٹھی اور کار اشارت کر کے کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ قیصر اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلا۔ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے وہ شہناز کی ٹکیل کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سن سکا تھا اگر سن لیتا تو شاید اس کا رد عمل کچھ اور ہوتا مگر اب تو صرف اسے یہ فکر تھی کہ اس نے گولیاں بدل دی ہیں۔ ٹکیل گولیاں کھالے گا بھی تو مرے گا نہیں۔ وہ دبے قدموں چلتا شہناز کے پیچھے ہی کوٹھی میں پہنچ گیا۔

شہناز اپنے کمرے میں آئی۔ اپنا بیگ کھول کر تمام گولیاں نکالیں انہیں اپنی غائبی میں حفاظت سے اپنی الماری میں رکھا اور پھر عدنان کے کمرے کی طرف چل دی۔ دیکھنے کے لیے کہ ٹکیل عدنان کی حیثیت سے کمرے میں واپس آ چکا ہے یا نہیں۔

ادھر وہ باہر نکلی ادھر قیصر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ کھڑکی کے پردے کی آڑ میں وہ سب کچھ دیکھتا رہا تھا۔ اس نے الماری کھول کر تھوڑی سی تلاش کے بعد وہ شیشی حاصل کر لی اور جس طرح چپ چاپ آیا تھا ایسے ہی باہر نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ٹکیل تو اب جا چکا ہے اور شیشی کل کالج میں ہی کسی بہانے اسے پہنچائی جاسکے گی۔

مگر جب قیصر کوٹھی سے نکل کر سڑک پر آیا تو کچھ دور چلنے کے بعد ٹکیل اسے نظر آ گیا۔ وہ بڑے کھوئے ہوئے انداز میں چند قدم چلتا اور پھر رک کر کچھ سوچتا۔ آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر ایک ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سر جھکا کر چلنے لگتا۔ قیصر نے جلد ہی اسے جالیا۔

”ٹکیل صاحب۔“ اس نے آواز دی۔ مگر شاید ٹکیل نے سنا ہی نہیں۔

”میں نے کہا ٹکیل۔۔۔ ٹکیل صاحب۔“ قیصر نے قریب پہنچ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”یہاں کہاں ٹھل رہے ہیں۔“

”آپ کون ہیں؟“ ٹکیل نے چونک کر قیصر کی طرف دیکھا۔

”ارے بھئی قیصر ہوں آپ کا دوست۔“

”اوہ! قیصر صاحب۔“ ٹکیل کو جیسے ہوش آ گیا۔ ”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔“

”بھئی وہ آپ تو شیشی لے کر چلے آئے مگر بعد کو اچانک خیال آیا کہ اس میں جو لیاں ہیں وہ بچوں کے خود کشی کرنے کی ہیں میرا مطلب ہے بہت کم پاور کی ہیں۔ پوری شیشی بھی کھا گئے تب بھی کوئی اثر نہیں ہوگا۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ قیصر صاحب۔“ ٹھیل گھبرا کر بولا۔ ”اب کیا ہوگا“ میں تو بے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ قطعی اور پکا۔“

”آپ کا وعدہ میرا وعدہ ہے۔ میرے ہوتے ہوئے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ قیصر نے ہمدردی جتائی۔

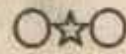
”یعنی میرے بجائے آپ زہر کھائیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ ٹھیل نے چونک کر

”میرا مطلب تھا۔“ قیصر جلدی سے بولا۔ ”میں آپ کے لیے زیادہ پاور کی گولیاں لے ہوں۔ آپ وہ گولیاں مجھے دے دیں اور یہ لے لیں۔“

”خدا آپ کو خوش رکھے قیصر صاحب۔ دوست ہو تو بچ بچ ایسا ہی ہو۔ آپ میرے کام آرہے ہیں۔ میری دعا ہے خدا آپ کا بھی کام تمام کرے۔“ ٹھیل نے بڑے جوش ساتھ کہا اور شیشی جیب سے نکال کر قیصر کے ہاتھ میں دے دی۔

قیصر نے اس کی گولیاں نکال لیں اور شہناز کی الماری سے لائی ہوئی شیشی کی گولیاں میں بھر دیں۔

”لیجئے اب آپ اطمینان سے خود کشی کر سکتے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔



دوسرے دن کلیل دن بھر کالج کے پارک میں اپنی پسندیدہ بیچ پر بیٹھا رہا۔ اردو کے کھنے کے بعد شہناز حسب معمول لائبریری جا رہی تھی کہ اس کی نظر کلیل پر پڑی اور وہ پارک کی جانب گھوم گئی۔ کلیل اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

”مجھے امید تھی کہ تم آخری مرتبہ مجھ سے ملنے ضرور آؤ گی۔“ وہ بولا۔
 ”مگر مجھے امید نہیں تھی کہ میں آج بھی آپ کو زندہ سلامت دیکھوں گی۔“ شہناز نے جواب دیا۔ ”بلکہ میں تو ابھی پڑوین سے کہہ رہی تھی کہ پتا نہیں شام کے اخبارات کس وقت نکلتے ہیں، آج مجھے ایک بہت خاص خبر دیکھنا ہے۔ وہ پوچھتی بھی رہی کہ ایسی کیا خبر ہے مگر میں نے نہیں بتایا۔ ویسے وہ یہی سمجھ رہی ہے کہ شاید پرائز بانڈ کے نمبر آنے والے ہیں۔“

”جتنا چاہو مذاق اڑالو شہناز۔“ کلیل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تمہیں تو شاید اس وقت بھی یقین نہیں آئے گا جب میری لاش تمہارے قدموں میں پڑی ہوگی۔ بہر حال اب ان سب باتوں سے کوئی فائدہ نہیں، میں نے اب تک زہر صرف اس لیے نہیں کھایا تھا کہ میں تمہارے سامنے مرنا چاہتا تھا۔“

”یہاں کالج میں۔“ شہناز گھبرا کر بولی۔ ”کیا آپ مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔“
 ”جی تو یہی چاہتا تھا مگر خیر تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کسی مرنے والے سے پالا پڑا تھا۔ ہم سے باہر چاندنی باغ میں چلیں گے۔“

”لیکن آپ تو زہر کھا کر وہاں مرجائیں گے میں واپس کس کے ساتھ آؤں گی۔“ شہناز نے پریشانی سے کہا۔ ”اس کے علاوہ مجھے لاشوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ نہیں جناب میں نہیں جاسکتی۔“

”تمہارے پاس تمہاری اپنی کار ہوگی۔ تم بڑی آسانی سے واپس آسکتی ہو۔“ کلیل نے کہا۔ ”جہاں تک لاشوں سے ڈرنے کا سوال ہے، خواب آور دووا کی گولیاں سناٹاؤ زہر

نہیں ہوتیں کہ زبان پر رکھا اور معاملہ ختم۔ پتا نہیں کتنے گھنٹے مرنے میں لگیں گے میں صرف تمہارے سامنے گولیاں کھانا چاہتا ہوں اس کے بعد تم بے شک چلی آنا۔“
 شہناز جیسے سوچ میں پڑ گئی۔
 ”کیا تم مرنے والے کی آخری خواہش بھی پوری نہیں کر سکتیں۔“ کلیل نے افسردگی سے کہا۔

”اچھی بات ہے۔“ شہناز نے جواب دیا۔ ”آپ کا آخری گھنٹا خالی ہے۔“
 ”میرے اب سارے ہی گھنٹے خالی ہیں۔“ کلیل نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آج پرنسپل کو اپنا نام خارج کرنے کی درخواست دے دی ہے۔“
 ”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ساڑھے تین بجے اپنی کار میں کالج کے گیٹ کے پاس آپ کا انتظار کروں گی۔“ شہناز نے جواب دیا اور جانے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ رک گئی۔
 ”سنئے۔“ وہ بولی۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آج سہ پہر کے اخبارات میں تو آپ کے مرنے کی خبر نہیں آسکتی۔“
 ”تم پریشان مت ہو، میں نے جو کہا ہے حرف بحرف پورا ہوگا۔“ کلیل نے جواب دیا۔

”مگر کیسے؟“ شہناز نے الجھتے ہوئے کہا۔
 ”میرا ایک دوست اخبار کا پرنٹرو پبلشر ہے اس سے کہہ کر ایک خصوصی ضمیمہ نکلوا دوں گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ شہناز نے اطمینان ظاہر کیا۔ ”اچھا تو پھر بھولیے گا نہیں۔“
 ساڑھے تین بجے سے ایک منٹ بھی اوپر نہیں ہونا چاہیے۔ میں زیادہ انتظار کرنے کی عادی نہیں ہوں۔“

شہناز یہ کہہ کر لائبریری کی طرف چل دی۔ کلیل پھر اسی بیچ پر بیٹھ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر پودوں کے پیچھے قیصر اور مجیب دبے پاؤں اپنی جگہ سے اٹھ کر پارک سے باہر نکلے اور بری طرح تھکے لگانے لگے۔

”یار یہ ٹھیک تو سچ مچ مجنوں بنا ہوا ہے۔“ مجیب نے ہنستے ہوئے کہا۔
 ”سچ کہتے ہو۔“ قیصر نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ میں ٹھیک کو اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا۔“

”بھیا ایک بات ہے یہ شخص میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا۔“ مجیب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اس رات جس جوڑ توڑ سے کام لے کر اس نے ہماری اسکیم کو ناکام بنایا تھا، وہ کسی احمق آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔“
 ”تمہیں کیا معلوم کہ وہ ٹھیک کا ذہن تھا یا شہناز کا جس نے ہماری پکی پکائی کھیر دلیا بنا دی۔“ قیصر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اب یہی دیکھ لو نا کہ وہ بظاہر اسے زہر کھانے پر اکسارہی ہے مگر اندر ہی اندر اس نے بڑی چالاکی سے زہر کی گولیاں تبدیل کر کے اس بات کا اطمینان کر لیا ہے کہ ٹھیک گولیاں کھا بھی لے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے۔ شاید وہ اس کی محبت کو آزمانا چاہتی ہے۔ واقعی کسی فلسفی نے سچ کہا ہے کہ عورت ایک ایسی پہلی ہے جسے مرد ابتدائے آفرینش سے بوجھنے کی کوشش کر رہا ہے مگر آج تک نہیں بوجھ سکا۔“

”میں حیران ہوں کہ شہناز جیسی لڑکی نے ٹھیک میں ایسی کون سی خوبی دیکھ لی ہے جو اس پر یوں لٹو ہو رہی ہے۔ دل کے سمجھانے کو بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ شاید اس کی حماقت انگیز باتیں ہی اسے پسند آگئی ہیں۔“

”بہر حال تمہیں کیا فکر ہے۔“ مجیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ایک مرتبہ شہناز نے تمہاری اسکیم ناکام بنا دی تھی۔ اس بار تم نے اس کا بدلہ لے لیا۔ ٹھیک صاحب تو انا اللہ ہو ہی جائیں گے پھر شہناز اور تمہارے درمیان کوئی دیوار نہیں رہے گی۔ سچ پوچھو تو یہ موقع ایک شاندار دعوت کھلانے کا ہے۔“

”نہیں دوست مجھے یقین ہے کہ ٹھیک کے مرنے کے بعد بھی شہناز میری نہیں بن سکے گی چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ٹھیک کے ساتھ ہی میں بھی خواب آور گولیاں کھا کر اللہ کو پیارا ہو جاؤں گا۔“

مجیب نے چونک کر قیصر کی طرف دیکھا۔ قیصر نے اپنی جیب سے ایک شیشی نکالی۔
 ”یہ شیشی میری مشکل آسان کر دے گی۔“ اس نے بڑی اداکاری کے ساتھ کہا۔
 مجیب جو ایک لے کے لیے خاموش اور حیران رہ گیا تھا ایک دم کھل کھلا کر ہنس پڑا۔
 تو آپ ان گولیوں سے خودکشی کریں گے۔“ اس نے پوچھا۔
 ”کیوں نہیں۔“ قیصر نے ایک ہاتھ سینے پر مارتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم نے سنا نہیں
 مرنے والے توفیق بات سے مر جاتے ہیں یہ تو پھر شکر کی گولیاں ہیں۔“
 ”یار مرتے وقت شعر تو غلط مت پڑھو اصل مصرع یوں ہے کہ مرنے والے توفیق بات
 پر مر جاتے ہیں۔“

”بھئی یہ بات پر مرنا اپنے پلے نہیں پڑتا۔“ قیصر نے مزاحیہ انداز سے کہا۔ ”یہ کیا
 بات ہوئی کہ بات بے چاری نیچے دبی ہوئی کراہ رہی ہے اور عاشق صاحب اس کے اوپر بیٹھے
 زہر کا جام پی رہے ہیں۔“

”سبحان اللہ اس انداز سے اگر شعروں کا مطلب سمجھنا شروع کر دیا گیا تو کم سے کم
 اردو کی عشقیہ شاعری اور بوچڑ خانے میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہے گا۔ بہر حال یہ الگ
 اور بحث طلب مسئلہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ تم نے بھی مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر انتظار کی
 کیا ضرورت ہے ابھی شہناز کا نام لے کر گولیاں کھا جاؤ اس طرح تمہیں کم سے کم ایک
 معاملے میں تو کلیل پر سبقت حاصل ہو جائے گی۔“

”بات تو سوچیے درست کہہ رہے ہو۔“ قیصر نے گھڑی دیکھی۔ ”ابھی ساڑھے بارہ
 بجے ہیں اس وقت گولیاں کھا کر چاندنی باغ میں ہونے والے رومانی ڈرامہ دیکھنے کی حسرت
 رہ جائے گی۔ ٹریلوئے ابھی دیکھ چکے ہیں کہ ہیروئن اپنی کار میں ہیرو کو لاد کر ٹھیک ساڑھے
 تین بجے یہاں سے روانہ ہوگی چنانچہ تین بجے کافی ہاؤس میں رسم جاں فروشی و جانبازی ادا
 کی جائے گی۔“



سواتین بجے فکیل پارک سے اٹھ کر کالج کے گیٹ کی طرف چلا تو راستہ میں رشید مل گیا۔

”خیریت تو ہے فکیل بھائی۔ آج آپ نے کوئی پیریڈ اینڈ نہیں کیا۔“ اس نے پوچھا۔
 ”ہاں بھائی کچھ تو ہے اور باقی خیریت، امید ہے چار بجے تک مکمل ہو جائے گی۔“
 فکیل نے جواب دیا۔ اچھا ہوا تم مل گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمہارا شکریہ بھی ادا کروں۔“

”کیس جارہے ہیں۔“ رشید نے حیرت سے پوچھا۔
 ”ایک مشن کی تکمیل کے لیے آیا تھا وہ پورا ہو گیا تو اب واپس جا رہا ہوں۔“ فکیل نے کہا۔ ”اسپتال گئے تھے۔“
 ”ہاں! صبح کالج آنے سے پہلے گیا تھا۔“
 ”اب امجد کی حالت کیسی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ایک دو دن میں اسے چھٹی مل جائے گی۔“ رشید مسکرایا۔
 ”ویسے وہ اب بھی حیران ہے کہ آپ کو قیصر کی سازش کا علم کیسے ہو گیا۔ کہہ رہا تھا کہ میں فکیل صاحب کو اتنا بڑا اداکار نہیں سمجھتا تھا۔ وہاں ریسٹورنٹ میں انسپکٹر نیازی کی داستان انہوں نے اس فطری انداز میں سنائی کہ مجھے شبہ تک نہیں ہوا کہ وہ اپنی جگہ مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہتے ہیں۔“

”قیصر اور مجیب کو تو کچھ شک نہیں ہوا۔“ فکیل نے پوچھا۔
 ”بالکل بھی نہیں ہوا وہ تو دو ہزار روپیہ لے کر پولیس اسٹیشن تک بھی جا پہنچے تھے مگر وہاں کوئی انسپکٹر نیاز احمد نیازی ہوتا تو ملتا۔“ رشید نے جواب دیا۔ ”ویسے گستاخی معاف فکیل صاحب اس میں شک نہیں کہ آپ انتہائی پراسرار قسم کے آدمی ہیں یا کم سے کم وہ نہیں ہیں جو اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ میں نے آپ کو تقریباً چھ بجے فون کیا تھا اور چھ

بچے سے آٹھ بجے تک صرف دو گھنٹے کے درمیان جبکہ آپ وہاں کھیل میں بھی مصروف تھے۔ اتنی شاندار اسکیم سوچ لینا کسی معمولی ذہن کے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔“

”اس میں میرا کوئی خاص کمال نہیں تھا۔“ کلیل مسکرایا۔ ”بس کچھ حالات ہی ساتھ دے گئے تھے اور پھر جب میں نے تم سے فون پر گفتگو کی تھی اس وقت تو اسکیم بھی وہ نہیں تھی جو آخر کار عمل میں لائی گئی۔ تمہیں الیکٹرنیازی بن کر وہاں پہنچنے کی ہدایت کرتے ہوئے مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ تمہیں میرے بجائے امجد کو بچانے کا موقع ملے گا۔ پہلے وہ سوٹ پھر بھکاری بڑے میاں اور آخر میں امجد کے ملنے کا اتفاق ہوا تو بس اچانک ہی خیال آگیا کہ تھوڑی سی کوشش سے ان حضرات کو ایک دلچسپ سبق دیا جاسکتا ہے۔“

”سچ کہا آپ نے۔ یہ بھی تو اتفاق ہی تھا کہ جب مجب میرے پاس آیا تو اس کے منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ اس وقت آپ شہناز صاحبہ کی کوٹھی میں ہیں ورنہ میں سازش کا علم ہونے کے باوجود آپ کو وقت پر خبردار نہیں کر سکتا تھا۔“

”اچھا دوست۔“ کلیل نے رسٹ واج پر نظر ڈالتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ”اب اجازت دو۔“

”تو کیا دوبارہ ملاقات ہو سکے گی۔“

”ہو بھی سکتی ہے۔“ کلیل مسکرایا۔ ”مگر ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”رشید سے رخصت ہو کر کلیل کالج کے گیٹ سے باہر آیا تو شہناز اپنی کار لیے موجود تھی۔

”مجھے دیر تو نہیں ہوئی۔“ کلیل نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں۔“ شہناز نے پوچھا۔

”بیٹھ رہا ہوں۔ کیوں؟“ کلیل نے کچھ حیرت سے جواب دیا۔

”اگلی سیٹ پر؟“

”اوہ تمہارا مطلب ہے شادی سے پہلے ہمیں ساتھ ساتھ نہیں بیٹھنا چاہیے۔“

”شادی۔ مگر آپ تو مرنے جا رہے ہیں۔“

”بالکل۔۔۔ بالکل۔“ کلیل نے گردن ہلائی۔ ”میرا مطلب بھی یہی تھا۔ شادی بھی تو ایک طرح کی موت ہوتی ہے۔ نہ ہوتی تو لغت میں شادی مرگ کا لفظ کیوں شامل کیا جاتا تو پھر بیٹھ جاؤں۔“

”چلئے بیٹھ جائیے۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔“ شہناز نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا اور کار ایک خفیف سے جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

چاندنی باغ شہر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک پر فضا باغ تھا۔ جو محض پبلک کی سیر و تفریح کی خاطر بنایا گیا تھا۔ شہناز نے کار کو باغ کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔ کالج سے چلنے کے بعد سے اب تک دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

”کوئی بات کرو تاکہ سفر آسانی سے کٹ جائے۔“ کلیل بولا۔

”کیا بات کروں؟“

”بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں۔“ کلیل نے جواب دیا۔ ”مثلاً یہ کہ تمہیں میری بے وقت موت بلکہ جواں مرگی پر بہت افسوس ہے، تم ہمیشہ مجھے یاد کرتی رہو گی اور یہ کہ پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے۔ حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مر جھا گئے وغیرہ وغیرہ۔“

”مگر یہ سب باتیں میں کیوں کروں؟“ شہناز نے کہا۔

”کیا سچ تمہیں میرے مرنے کا اتنا سا بھی افسوس نہیں ہے۔“ کلیل نے کچھ ناگواری سے کہا۔ ”سچ کہتا ہوں اگر زہر نہ خرید چکا ہوتا تو اسی بات پر مرنے کا پروگرام کینسل کر دیتا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں کو مزا نہیں آیا۔“

”میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ آپ بس بہانہ تلاش کر رہے ہیں، اپنی جان بچانے کا۔“ شہناز نے ناک سکوڑی۔ ”سچ سچ اگر وہاں جا کر آپ نے خودکشی نہیں کی تو بڑی بوریٹ ہو گی۔“

کلیل ابھی کچھ جواب دینے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کار کو ایک جھٹکا سا لگا۔ موڑنے جھرجھری سی لی اور کار چند گز آگے جا کر رک گئی۔

”یہ کیا ہوا؟“ ٹکیل نے پوچھا۔

”ہتا نہیں۔“ شہناز نے اشارت سے الجھتے ہوئے جواب دیا۔ ”شاید کار کچھ خراب ہو گئی ہے۔“

”وہ دروازہ کھول کر نیچے اتری اور کار کا ہڈ کھول کر دیکھنے لگی۔

”دیکھا تم نے۔“ ٹکیل اس کے ساتھ ہی اترتے ہوئے بولا۔ ”کار تک کو میرے مرنے کا غم ہو رہا ہے۔“

”کہیں بھی نہیں۔“ شہناز نے ہڈ بند کر دیا۔ ”بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے۔ ذرا دھکا لگائیے۔ ابھی اشارت ہو جائے گی۔“

”کیا؟“ ٹکیل چونکا۔ ”میں دھکا لگاؤں۔“

”مجبوری ہے۔“ شہناز نے کندھے اچکائے اور اسٹیرنگ سنبھال کر بیٹھ گئی۔ ”چلئے شروع ہو جائیے۔“

”واہ میرے مولا۔“ ٹکیل نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ”خود کشی بھی کرو اور محبوبہ کی کار کو دھکا بھی لگاؤ۔“

اس نے پیچھے جا کر دھکا لگایا۔ تقریباً پندرہ بیس گز آگے جا کر کار اشارت ہو گئی۔ ٹکیل جلدی سے بھاگ کر آگے آیا۔ شہناز نے کار روکی نہیں تھی، چلتی کار کا دروازہ کھول کر بڑی مشکل سے اندر بیٹھ سکا۔

”یہ کیا حرکت تھی۔“ وہ اندر بیٹھ کر ہانپتے ہوئے بولا۔ ”کار کیوں نہیں روکی؟ ابھی میرا پیر پھسل جاتا اور میں کار کے نیچے آ جاتا تو۔“

”تو کیا ہوتا۔“ شہناز نے جواب دیا۔ ”زیادہ سے زیادہ مر ہی تو جاتے فائدہ ہی تھا۔ چاندنی باغ تک جانے کی زحمت نہ کرنی پڑتی۔“

”سچ کہتا ہوں تم سے زیادہ سنگ دل محبوبہ چشم فلک نے آج تک کہیں نہ دیکھی ہوگی۔“

”آپ ابھی ایک مرتبہ پہلے بھی یہ غیر اخلاقی لفظ استعمال کر چکے ہیں۔“ شہناز نے

ترشی سے کہا۔ ”مجھے اس پر سخت اعتراض ہے اگر آپ نے تیسری مرتبہ اس کا اعادہ کیا تو میں ہمیں سے واپس لوٹ جاؤں گی۔“
”کونسا؟“

”یہی جو ابھی آپ نے چشم فلک سے پہلے استعمال کیا تھا۔“
”تمہارا اشارہ محبوبہ کی طرف تو نہیں ہے؟“

”ہاں۔“ شہناز نے سر ہلایا۔ پھر وہ چونک کر بولی۔ ”پھر وہی“ میں کار واپس موڑتی ہوں۔“

”بھئی میں نے تو پوچھا تھا۔ تمہیں استعمال کرنے کا ارادہ تو نہیں تھا۔“ ٹکیلنے جلدی سے صفائی پیش کی۔

”جی۔“ شہناز نے تیوری چڑھائی۔

”افوہ کیا مصیبت ہے۔ اب میں ”تمہیں“ کی جگہ وہ لفظ کہتا تو تم پھر خفا ہوتیں۔ چونکہ وہ لفظ اور تم ایک ہو اس لیے میں نے مترادف بولنے کی کوشش کی تھی مگر تمہیں یہ بھی گوارا نہیں۔“

”آپ منہ بانہ باتیں نہیں کر سکتے تو خاموش ہو جائیے۔“ شہناز نے بدستور تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

”ناراض مت ہو۔“ چاندنی باغ اب زیادہ دور نہیں رہ گیا ہے۔ میں وہاں پہنچ کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاؤں گا۔“ ٹکیلنے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مگر سچ کہتا ہوں اس وقت تم خواہ کتنی ہی سبک دل بننے کی کوشش کرو۔۔۔ مگر ایک دن آئے گا جب تمہیں احساس ہو گا کہ میں نے تمہارے لیے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ اس دن تم میرے لیے روؤ گی، تڑپو گی، آنسو بہاؤ گی اور میں کہوں گا۔ ہائے اس زود پشیمیاں کا پشیمیاں ہونا۔ بس۔۔۔ بس۔۔۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ بے شک میں مرچکا ہوں گا مگر کہیں نہ کہیں تو موجود ہوں گا ہی۔“

”وہ آرہے ہیں۔“ قیصر نے سگریٹ کا ٹوٹا پھینکتے ہوئے کہا۔ ”جلدی سے اس درخت کے پیچھے چھپ جاؤ۔“

مجیب نے چونک کر روش کی طرف دیکھا جہاں ٹھکیل اور شہناز ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے اور پھرتی سے درخت کے موٹے تنے کی آڑ میں ہو گیا۔ قیصر اس کے قریب ہی دوسرے درخت سے لگا کھڑا تھا۔

”ٹھکیل اور شہناز تالاب کے قریب آئے۔“

”میرے خیال میں یہ خودکشی کے لیے بہت آئیڈیل اسپاٹ ہے۔“ شہناز نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گولیاں نگفنے کے لیے فوارے کا پانی استعمال کیا جاسکتا ہے۔“

”دنیا کی کسی مح... میرا مطلب ہے اسی لفظ سے جس سے تمہیں چڑ ہے، آج تک اپنے محبت کرنے والے کے لیے خود ہی خودکشی کرنے کی جگہ کا انتخاب نہیں کیا ہو گا۔“

ٹھکیل نے جواب دیا۔ ”ویسے تمہارا خیال ٹھیک ہی ہے۔“

”پانی کے لیے کوئی گلاس وغیرہ بھی ساتھ لائے ہیں یا نہیں۔“ شہناز نے پوچھا۔

”گلاس۔“ ٹھکیل چونکا۔ ”گلاس تو نہیں ہے مگر کوئی بات نہیں، چلو سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ لوگ تو چلو بھر پانی ڈوبنے کے لیے کافی سمجھتے ہیں، کیا اس سے چند گولیاں حلق سے نیچے نہیں اتاری جاسکتیں۔ البتہ پولیس کے لیے کچھ درد سری ضرور ہو جائے گی۔“

”پولیس کے لیے درد سری۔ وہ کیا؟“ شہناز نے پوچھا۔

”اسے یہ فیصلہ کرنا خاصا مشکل ہو گا کہ میں خواب آور دوا کی گولیاں کھا کر مرا ہوں یا محاورے کے مطابق چلو بھر پانی میں ڈوب کر۔“ ٹھکیل نے جواب دیا۔

”اچھا اب جلدی کیجئے۔“ شہناز نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جلدی سے پانی لے کر گولیاں کھائیے۔ مجھے ابھی واپس بھی جانا ہے۔“

”ابھی وقت ہے ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔ تمہیں یقین ہے کہ تم میری موت برداشت

کر لوگی۔“ کلیل نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“ آخر آئے دن اخبارات میں طرح طرح کے حادثوں کی خبریں سن کر برداشت کرتی ہی ہوں۔“

”تو تم سچ مجھے موت کے گھاٹ اتارے بغیر نہیں مانو گی۔“ کلیل نے ایک ٹھنڈی گہری سانس بھری اور تالاب کے کنارے لگے ہوئے فوارے کے قریب بیٹھ گیا۔ جیب سے گولیوں کی شیشی نکالی۔ شہناز کی طرف دیکھا اور پوری کی پوری شیشی منہ میں الٹ لی۔ جلدی جلدی دو چار دفعہ منہ چلایا۔ ہاتھ بڑھا کر فوارے سے چلو میں پانی لیا۔ دو تین گھونٹ اسی طرح لیے اور کھڑا ہو گیا۔

”بس اب تو تمہارے دل کو چین آگیا ہو گا۔“ کلیل نے بڑے طنزیہ لہجے میں شہناز سے کہا۔

ابھی شہناز کوئی جواب نہیں دے پائی تھی کہ گیٹ کی طرف سے آنے والی روش پر بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ بلند ہوئی۔ کلیل اور شہناز نے بھی گھوم کر دیکھا۔ پروین افتاں و خیزاں دوڑتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ شہناز کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے۔ ”خدا کا شکر ہے۔“ پروین قریب آکر ہانپتے ہوئے بولی۔ ”میں وقت پر پہنچ گئی۔“ اس نے کلیل کی طرف دیکھا۔

”ابھی آپ نے وہ گولیاں تو نہیں کھائی ہیں نا؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے پروین، تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“ شہناز نے کہا۔ ”پہلے آپ بتائیے؟“ پروین بدستور کلیل سے مخاطب تھی۔ ”آپ نے ابھی وہ گولیاں تو نہیں کھائیں۔“

درختوں کے پیچھے قیصر نے برا سامنہ بناتے ہوئے مجیب کی طرف دیکھا۔ ”آپ سے گولیوں کے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”گر یہ لوگ ابھی کلیل کو اسپتال لے کر پہنچ گئے تو وہ ضرور بچا لیا جائے گا۔“ ”گولیاں تو میں کھا چکا ہوں پروین۔“ کلیل نے ایک افسردہ منہ سے جواب دیا۔

”اب تو مرنے کا انتظار ہے۔“

”پھر تو غضب ہو گیا۔“ پروین نے بوکھلا کر کہا۔

”کیا غضب ہو گیا؟ تم آخر بتاتی کیوں نہیں؟“ شہناز کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔
 ”میں نے کیسٹ سے کہا تھا کہ وہ خواب آور دوا کی گولیوں سے ملتی جلتی شکر کی گولیاں
 بے دے۔“ پروین نے بتایا ”پھر اس نے جو گولیاں دیں وہ میں نے تمہیں لا کر دے دیں۔
 گولیاں خریدتے وقت میرے پاس سو روپیہ کا نوٹ تھا جس کی ریزگاری اس کے پاس نہیں
 تھی چنانچہ آج میں اسے پیسے دینے گئی تو اس نے بیس روپیہ مانگے میں نے اعتراض کیا کہ
 شکر کی گولیوں کی اتنی قیمت۔ اس پر وہ بولا کہ وہ شکر کی نہیں خواب آور گولیاں تھیں اور یہ
 کہ میرے پاس ڈاکٹر کا نسخہ نہیں تھا اس لیے بلیک کی رقم ادا کرنی پڑے گی۔“
 ”کیا؟“ شہناز چیخ اٹھی۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو۔ کیا وہ سچ سچ خواب آور دوا کی گولیاں
 تھیں۔“

”ہاں شہناز۔“ پروین نے جواب دیا۔

”اوہ خدا یہ میں نے کیا کیا؟“ شہناز بھرتی ہوئی آواز میں بولی۔

درختوں کے پیچھے قیصر نے گھبرا کر عجیب کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔
 ”عجیب۔“ وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔ ”سنا تم نے وہ گولیاں شکر کی نہیں تھیں۔ میں نے
 خواب آور گولیاں کھالی ہیں۔ جلدی کرو عجیب مجھے جلدی سے اسپتال لے چلو ورنہ میں مر
 جاؤں گا۔“

وہ تیزی سے گھوما اور باغ کے دروازے کی طرف بھاگتا چلا گیا عجیب بھی اس کے پیچھے
 دوڑا جا رہا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دونوں کیا الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو۔“ ٹکیل نے
 کہا۔ ”تم نے مجھے مرنے کا حکم دیا تھا اور میں نے اس کی تعمیل میں خواب آور دوا کی گولیاں
 کھالیں تو اب کیا قیامت آگئی۔ آخر تم یہی چاہتی تھیں۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ شہناز نے روتے ہوئے زور زور سے سر ہلایا۔

”کیا نہیں۔۔۔ نہیں۔“ ٹکیل نے حیرت سے کہا۔

”اے جلدی سے گھر لے چلو شہناز۔“ پروین بولی۔ ”اس طرح رونے سے کیا ہوگا۔ ہم اب بھی کھیل صاحب کی جان بچا سکتے ہیں۔“

”شہناز کو ایک دم جیسے ہوش سا آگیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر کھیل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آئیے۔“ وہ اسے کھینچتے ہوئے بولی۔

”کہاں؟“

”گھر۔“

”مگر میں یہیں مرنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کہئے۔“ شہناز نے کھیل کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں آپ کو مرنے نہیں دوں گی۔“

”عجیب بات ہے حالانکہ تم نے ہی مجھے زہر کھانے پر مجبور کیا تھا۔“

”میں نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا۔“ شہناز نے روتے ہوئے کہا۔

”پھر مجھے گولیاں کھاتے چپ چاپ کیوں دیکھتی رہیں؟“

”میں نے آپ کی لائی ہوئی گولیاں بدل دی تھیں اور یہ سمجھ رہی تھی کہ جو گولیاں آپ کھا رہے ہیں وہ شکر کی ہیں اور آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں مگر میری تقدیر میرے ساتھ ایک خوفناک مذاق کر رہی تھی۔ وہ سچ سچ زہر کی گولیاں تھیں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجئے اور جلدی سے میرے ساتھ گھر چلئے۔ ابھی آپ کی زندگی بچائی جاسکتی ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ کھیل نے جواب دیا۔ ”کیا زہر کھانے سے پہلے تم نے میری بات مانی تھی۔ تم برابر میرا مذاق اڑاتی رہیں، مجھ سے نفرت کا اظہار کرتی رہیں۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تم نے جو چاہا تھا وہ میں نے کر دکھایا۔ اطمینان سے گھر جاؤ۔ میں نے اپنے دوست سے کہہ کر ضمیمہ نکالنے کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ میں نہیں مرا تو تمہیں کتنی مایوسی ہوگی ذرا سوچو تو۔“

”پروین خدا کے لیے تم ہی انہیں سمجھاؤ۔“ شہناز نے بے بسی سے پروین کی طرف

کھا۔

”کلیل بھائی آپ نے مجھے بہن کہا تھا۔“ پروین بولی۔

”بس غلطی سے منہ سے نکل گیا تھا۔“

”غلطی سے ہی سہی۔ کہا تو تھا۔“

”ہاں تو پھر؟“

”تو پھر اپنی بہن کی ایک بات مان لیں۔ گھر چلے چلیں۔“

کلیل جیسے سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا مصیبت ہے؟“ وہ بولا۔ ”یہ لڑکیاں نہ جینے دیتی ہیں اور نہ چین سے مرنے دیتی

ہیں۔ اچھا چلو مگر میں کوئی علاج و لاج نہیں کراؤں گا۔ ہاں کہہ دیتا ہوں۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ آپ چلے تو سہی۔“ پروین نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں

س کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی کار تک لائیں۔

”کار میں چلاؤں گا۔“ کلیل جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ آپ کیسے چلا سکیں گے۔“ شہناز گھبرا کر بولی۔

”اس وقت ان کی کسی بات۔۔۔ سے اختلاف مت کرو۔“ پروین نے اس کے کان

میں سرگوشی کی۔ جیسا کہتے ہیں کرتی جاؤ۔“ شہناز نے اثبات میں سر ہلایا اور دوسری طرف

سے جا کر اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولا۔

”یہ کیا کر رہی ہو۔“ کلیل نے تیوری چڑھائی۔ ”بچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھو۔“

شہناز نے چونک کر کلیل کی طرف دیکھا اور پھر چپ چاپ بچھلی سیٹ کی طرف گھوم

گئی۔

”اچھا چلو آؤ۔“ بیس بیٹھ جاؤ۔“ کلیل نے کار اشارت کرتے ہوئے آواز دی۔ شہناز

کلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔

کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ پروین بچھلی سیٹ پر تھی۔

”آپ کو نیند تو نہیں آرہی کلیل بھائی۔“ اس نے پوچھا۔

”سربھاری ہو رہا ہے۔“ کلیل نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ”شاید نیند ہی کی وجہ سے

ہو۔“

شہناز بڑی کوشش سے آنسو ضبط کر رہی تھی مگر پھر بھی پلکیں بار بار بھیگ جاتی تھیں جنہیں وہ ساڑھی کے آنچل سے خشک کرتی جا رہی تھی۔
تقریباً دو میل آنے کے بعد کار اچانک رک گئی۔

”کیا ہوا؟“ گھبرا کر شہناز نے پوچھا۔

”پتا نہیں انجن بند ہو گیا؟“ کھلیل نے بتایا۔ دروازہ کھول کر نیچے اترا، ہڈ کھولا۔ کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔

”بٹیری ڈاؤن ہو گئی ہے۔“ اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں کو دھکا لگانے پڑے گا۔“

وہ پھر کار میں آکر بیٹھ گیا۔

”مگر۔۔۔ مگر بٹیری تو بالکل ٹھیک ہے۔“ شہناز نے بتایا۔

”گویا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ کھلیل نے حیزی سے کہا۔ ”چلو اترو نیچے۔ دھکا لگاؤ۔“

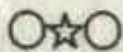
شہناز اور پروین جلدی سے نیچے اتر آئیں۔ بہت زور لگایا۔ کار آگے پیچھے جھولتی تو رہی مگر اپنی جگہ سے نہیں سرکی۔

”چلو آجاؤ۔“ کھلیل نے پلٹ کر ہاتھ ہلایا۔ ”بٹیری ٹھیک ہو گئی ہے۔“

اس نے انجن اشارت کر دیا۔ شہناز اور پروین دوبارہ کار میں آکر بیٹھ گئیں۔ کار آگے بڑھ گئی۔

”تمہاری کار بڑی بھاری ہے۔ شہناز۔“ پروین نے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ”تا زور لگایا مگر کیا مجال جو ایک انچ بھی آگے بڑھی ہو۔“

”کار بھاری نہیں ہے۔“ کھلیل نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔
”میں نے بریک لگا رکھا تھا۔“



کوٹھی کا گیٹ نظر آیا تو کھلی کی آنکھیں تقریباً بند تھیں اور وہ آگے پیچھے دائیں بائیں جھونکے سے لے رہا تھا۔

”مجھے بڑے زور کی غیند آرہی ہے شہناز۔“ اس نے جھونک کھا کر سنبھلتے ہوئے کہا۔
”یہ کوٹھی کا گیٹ کس طرف ہے۔“

”شہناز اس کی حالت دیکھ دیکھ کر پریشان ہوئی جارہی تھی۔
”کار روک دیجئے۔“ وہ گھبرا کر بولی۔ ”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کا راندر نہیں لے جاسکیں گے۔“

”کیوں نہیں لے جاسکیں گے۔“ کھلی نے قریب پہنچ کر اسٹیرنگ کوٹھی کی جانب کاٹا مگر کار کا سر گیٹ کی طرف نہیں دیوار کی جانب تھا۔
”خدا کے لیے۔“ شہناز نے جلدی سے اسٹیرنگ سنبھالنے کے لیے ایک ہاتھ بڑھایا۔ ”بریک مارے۔“

”اسٹیرنگ کو میرے ہاتھ سے لیتا کہ چلا میں۔“ کھلی نے جھوم کر مصرع پڑھا اور شہناز کے اوپر لڑھک گیا۔ شہناز نے اسٹیرنگ گیٹ کی جانب گھمایا۔ کار کی رفتار بہت ہلکی تھی ورنہ ایک سیڈنٹ لازمی تھا پھر بھی گیٹ سے بالکل چھو کر گزرتے ہوئے کار کوٹھی میں داخل ہوئی۔ شہناز نے اپنا پیر بریک کی طرف بڑھایا۔

”اے۔“ کھلی چلایا ”تم میرا پیر کیوں کچلے دے رہی ہو۔“
”شہناز نے جلدی سے پیر ہٹا لیا مگر ساتھ ہی حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے سوئچ سے چابی نکال لی۔ انجن ایک دم بند ہو گیا اور کار برآمدے کی سیڑھیوں سے ٹکراتے ٹکراتے
پہنچی۔

”خدا کا شکر ہے۔“ پروین نے گہری سانس لی۔ ”ورنہ آج کھلی صاحب نے تو ہمیں بھی مار دیا تھا۔“

”شہید محبت کو اتنا حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ساتھ دو چار ہم سفر بھی لیتا جائے۔“

کھیل آنکھیں بند کیے ہوئے بڑبڑایا۔

”پروین ذرا اس طرف آنا۔“ شہناز نے کہا۔ ہمیں جلدی سے انہیں اندر پہنچا کر ڈاکٹر کو فون کرنا ہے۔“

بڑی مشکل سے سہارا دے کر کھیل کو کار سے اتارا گیا۔ برآمدے میں گلشن مل گئی جو باورچی خانے سے آرہی تھی۔

”گلشن جلدی عدنان صاحب کا کرا کھول دو۔“ شہناز نے کہا۔

”اچھا بی بی جی۔“ گلشن نے حیرت سے کھیل کو دیکھتے ہوئے جواب دیا اور لپک کر آگے بڑھتے ہوئے عدنان کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

کھیل نے تقریباً اپنا سارا بوجھ شہناز اور پروین پر ڈالا ہوا تھا۔ کمرے کے اندر پہنچتے پہنچتے دونوں ہانپ گئیں۔ بڑی کوشش سے اپنی تمام تر قوت صرف کرتے ہوئے آخر وہ کھیل کو پلنگ تک لانے میں کامیاب ہو گئیں۔ گلشن نے چادر ہٹا کر تکیہ درست کیا اور شہناز نے کھیل کو بستر پر لٹا دیا۔

”امی اپنے کمرے میں ہیں؟“ شہناز نے گلشن سے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ گلشن نے جواب دیا۔

”کہاں گئی ہیں؟“

”بھی کوئی گھنٹا بھر پہلے بڑے صاحب آئے تھے بیگم صاحبہ ان کے ساتھ اسٹیشن گئی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ عدنان صاحب کے والد آرہے ہیں۔“

”اچھا ہے وہ بھی اپنے کنوارے بیٹے کی آخری رسومات میں شریک ہو جائیں گے۔“ کھیل نے بدستور آنکھیں بند کیے ہوئے کہا۔

”کیوں! عدنان صاحب کو کیا ہوا؟“ پروین نے حیرت سے کہا۔

”عدنان۔“ کھیل چونکا۔ ”اوہ میں بھول گیا کہ میں اس وقت..... لا حول ولا قوۃ.....

..... یعنی کہ..... میں تو عدنان نہیں ہوں۔ آرہے ہیں تو آنے دو مجھے کیا۔ جی چاہے تو شریک ہوں نہ چاہے تو نہ ہوں اور کیا۔“

افسردگی کے باوجود شہناز کو ہنسی آگئی۔

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”بس اور کچھ دیر کی بات ہے۔“ کلیل نے اونگھتے ہوئے جواب دیا۔
 ”پھر نہ تمہیں پوچھنے کی کچھ ضرورت باقی رہے گی اور نہ مجھے جواب دینے کی۔“
 ”ایسا نہ کہئے۔“ شہناز گلوگیر آواز میں بولی۔ ”آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں ابھی ڈاکٹر عثمان کو فون کرتی ہوں۔“

”ڈاکٹر۔“ کلیل بڑبڑایا۔ ڈاکٹر اب کیا کرے گا اگر۔ بلانا ہے تو کسی قاضی کو۔ میرا مطلب ہے کسی گورکن کو بلاؤ۔ بازار سے کچھ۔۔۔ چھوہارے یعنی کہ کوراٹھا اور ایک سر۔۔۔ افو۔۔۔ گویا کہ کچھ کافور اور کیوڑا وغیرہ منگوا لو کہ آخری منزل میں یہ چیزیں کام آتی ہیں۔“

”پروین ان کی بہکی بہکی باتیں مجھے پاگل کر دیں گی۔“ شہناز نے بھرائی آواز میں کہا۔
 ”تم ان کے پاس ٹھہرو میں فون کرتی ہوں جا کر۔“

وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔ گلشن ابھی تک حیرت سے کلیل کو دیکھ رہی تھی۔
 ”جاؤ تم اپنا کام کرو۔“ پروین نے اسے باہر چلتا کر دیا۔ اس کے جاتے ہی کلیل تڑپ کر بستر سے اٹھا اور الماری کھولی۔ الماری میں فون رکھا ہوا تھا۔

”نکل کے کمرے سے یہ فون اسی موقع کے لیے یہاں چھپا کر رکھا تھا۔“ کلیل پروین کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”اب ختم کیجئے ڈرامے کو۔“ پروین بولی۔ ”وہ غریب سچ گھبرائی جا رہی ہے۔“
 ”بس پانچ منٹ میں ابھی ڈرامہ سین ہوا جاتا ہے۔“ کلیل نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

دوسری جانب شہناز نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اسی وقت ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ کلیل اس کیسٹیشن کا ریسیور اٹھائے ہوئے تھا تو کوئی بھی نمبر ڈائل نہیں ہو سکتا تھا مگر شہناز نے اپنی پریشانی میں ڈرائنگ ٹون کا بھی خیال نہیں کیا۔ ادھر اس نے نمبر ڈائل کرنا ختم کیا۔ ادھر کلیل نے باریک سی آواز نکالی۔
 ”ہیلو۔ کون ہے؟“

”ڈاکٹر عثمانی کلینک۔“ کھیل نے حیرت سے دہرایا۔ ”اوہ! آپ کا مطلب ہے پلاننگ یعنی خاندانی منصوبہ بندی۔۔۔ جی نہیں یہ فیملی پلاننگ سینٹر نہیں ہے۔ رائگ نمبر۔“
 ”میں نے فیملی پلاننگ نہیں ڈاکٹر عثمانی کہا تھا۔“ شہناز کی آواز آئی۔ ”ڈاکٹر عثمانی ہیں۔“

”ڈاکٹر آسمانی گویا کہ حضرت عزرائیل جی نہیں وہ یہاں نہیں ہوتے۔ یہ ڈاکٹر عثمانی کی ڈپنٹری ہے کہنے تو ان سے بات کراؤں۔ وہ بھی ان کے ٹکر کے ڈاکٹر ہیں۔“
 ”میں ان سے ہی بات کرنا چاہتی ہوں ذرا جلدی کیجئے۔“
 ”ڈاکٹر آسمانی ہے۔“

”جی نہیں۔ ڈاکٹر عثمانی ہے۔“
 ”مگر میں نے آپ کو بتایا کہ یہاں ڈاکٹر عثمانی نہیں رہتے۔“
 ”افوہ!“ شہناز جھلا گئی۔ ”آپ کون صاحبہ بول رہی ہیں۔“
 ”بول رہی نہیں بول رہا ہوں۔ آواز باریک ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ میری جنس بدل دیں۔“

”دیکھیے مسٹر آپ جو کوئی بھی ہوں ڈاکٹر عثمانی کو فون دے دیں۔ ڈاکٹر عثمانی۔“
 شہناز نے اپنی جانب سے پوری وضاحت کر دی۔
 ”ذرا بچے کر کے بتائیں پلیز۔“ کھیل نے جواب دیا پھر فوراً ہی بولا۔ ”ناراض نہ ہوں ڈاکٹر ایک مریض کو دیکھ رہے تھے۔ اب فارغ ہو چکے ہیں بات کیجئے۔“ پھر لہجہ بدل کر بھاری آواز میں کہا۔
 ”ہیلو۔“

”ڈاکٹر عثمانی۔“ شہناز نے اطمینان کی سانس لی۔
 ”ہاں۔“

”میں شہناز بول رہی ہوں۔“
 ”بولو۔“

”آپ جلدی سے کوٹھی پر آجائیں۔ کھیل صاحب نے غلطی سے خواب آور دوا کی

گولیاں کھالی ہیں۔“ شہناز نے بتایا۔

”کھلیل صاحب۔ کوٹھی۔“

”اوہ آپ انہیں نہیں جانتے۔ وہ ہماری کوٹھی میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ابو کے دوست عرفان صاحب کے لڑکے ہیں۔“

ابو کون؟

”میں اپنے ابو کی بات کر رہی ہوں۔“

”میں بھی ان ہی کو پوچھ رہا ہوں۔“

”شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں شہناز ہوں شاکر حسین صاحب کی بیٹی۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“

”آپ فوراً یہاں آجائیے۔ کھلیل صاحب نے غلطی سے خوب آور گولیاں کھالی ہیں۔“ شہناز اب اتنی پریشان ہو چکی تھی کہ لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ اب روٹی اور تب روٹی۔

”بی بی جی۔“ گلشن ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ شہناز نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا ہے؟“

”یہ آپ کے فون کر رہی ہیں؟“

”ڈاکٹر عثمانی کو۔“ کچھ تعجب سے شہناز نے اسے گھورا۔

”مگر اس کمرے سے جواب تو کھلیل صاحب دے رہے ہیں۔“ گلشن نے بھانڈا پھوڑ

دیا۔

”کیا؟“ شہناز جو نکلی۔

”جی ہاں بی بی جی۔“ گلشن نے بتایا۔ ”میرے سامنے انہوں نے بڑے صاحب کے کمرے سے وہ دوسرا فون اٹھا کر الماری میں بند کیا تھا پھر ابھی جب آپ چلی آئیں تو پردین بی بی نے مجھے کمرے سے باہر جانے کو کہا مگر میں نے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ کھلیل صاحب نے الماری سے فون نکالا اور بات کرنے لگے۔“

”سچ کہہ رہی ہو؟“

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے بی بی جی۔“

شہناز نے ایک لمحہ غور کیا۔ کہیں پردین اور عدنان مل کر اسے بے وقوف تو نہیں بنا رہے۔ دوسری طرف سے ٹکیل کہہ رہا تھا۔

”تو شہناز بیگم مجھے خودکشی کرنے والوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اول تو میں ایسے کیس دیکھتا نہیں اور دیکھتا ہوں تو اپنی من مانی شرائط پر۔“

”شرائط! کیسی شرائط۔“ شہناز نے ریسیور میں کہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

”پہلی شرط یہ کہ مجھے باقاعدہ کارڈ بھیج کر بلایا جائے۔“ ٹکیل نے جواب دیا۔

”دوسری شرط یہ کہ کوٹھی کو دلہن کی طرح آراستہ کیا جائے۔“

”صرف کوٹھی کو۔“ شہناز نے بات کاٹی۔

”بھئی تمہارا دل چاہے تو تم بھی کوئی اچھا سا جوڑا پہن لینا مگر۔۔۔“ ٹکیل جیسے چونک سا گیا۔ ”کیا۔ کیا کہا تم نے۔“

”کچھ نہیں آپ اپنی شرائط بیان کریں۔“ شہناز نے جواب دیا اور اشارے سے گلشن کو قریب بلایا۔

”تم ذرا ریسیور پکڑے کھڑی رہو۔“ شہناز نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

گلشن کے ہاتھ میں ریسیور دے کر شہناز نے ڈرائنگ روم سے قدم نکالا ہی تھا کہ

ٹھٹک کر رک گئی۔ برآمدے میں شاکر صاحب اور بیگم شاکر عرفان صاحب کو ساتھ چلے

آ رہے تھے۔ شہناز گھبرا گئی مگر انہوں نے دیکھ لیا تھا۔ مجبوراً آگے بڑھ کر سلام کرنا پڑا۔

”جیتی رہو۔ خوش رہو۔“ عرفان صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

”عدنان کہاں ہے۔“ بیگم شاکر نے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں ہوں گے۔“ شہناز نے جواب دیا۔

بیگم شاکر عرفان صاحب کو ساتھ لیے عدنان کے کمرے کی طرف چلیں۔ شہناز جلدی

سے کمرے میں واپس آئی۔ گلشن ریسیور پکڑے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے ہنس رہی تھی۔

شہناز کو دیکھتے ہی سنجیدہ ہو گئی۔

شہناز نے چھٹ کر ریپور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ٹھیکل کہہ رہا تھا۔

”میری تیسری شرط یہ ہے کہ تم ابھی جا کر اس بد نصیب نوجوان سے معافی مانگو اسے یقین دلاؤ کہ تم اس کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتیں، تم نے اسے بہت پریشان کیا ہے، بہت بے وقوف بنایا ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو۔۔۔ میرا مطلب ہے اس سے وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرو گی جس سے مجھے تکلیف پہنچے۔ یعنی کہ۔۔۔ اسے تکلیف پہنچے۔ شادی کے بعد۔۔۔“

”عدنان صاحب۔۔۔ شہناز نے آہستہ سے کہا۔

”جی۔۔۔ لا حول ولا قوۃ۔ مجھے گڑبڑاؤ نہیں، میں ڈاکٹر نہیں عدنان۔۔۔ افوہ یعنی کہ عدنان نہیں ٹھیکل۔۔۔ دمت ترے کی۔۔۔ میرا مطلب ڈاکٹر عثمانی بات کر رہا ہوں۔“

”آپ کے والد صاحب آگئے ہیں۔“

”آگئے ہیں تو آنے دو۔ اب مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ میں تمہاری چاہت میں مر رہا ہوں۔ تمہاری محبت میں جان دے رہا ہوں۔“ عدنان کہتے کہتے رک گیا۔ ”کیا کہا تم نے کون آگئے۔“ شہناز نے ریپور میں عرفان صاحب کی گرجدار آواز سنی۔ ”کس سے باتیں کر رہے ہو۔ اس۔۔۔ مگر تم کون ہو؟ عدنان تو نہیں ہو سکتے۔“

”اوہ آپ۔۔۔ سلام علیکم ابا جی۔۔۔ میرا مطلب کسی سے نہیں۔ بس یونہی ذرا

شہناز۔۔۔ میرا مطلب ہے ایک لڑکی۔۔۔ افوہ۔۔۔ یعنی کہ ذرا سی بات ہے جی ہاں۔۔۔“

عدنان نے گھبرا کر زور سے ریپور کریڈل پر ڈال دیا۔

”شہناز باہر نکلی تو دوسری طرف سے پروین منہ میں دوپٹا دبائے بھاگتی آرہی تھی۔

”تو تم اور ٹھیکل صاحب مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔“ شہناز نے بظاہر بگڑ کر کہا۔

”ارے وہ ٹھیکل صاحب نہیں ہیں عدنان صاحب ہیں۔“

”میں جانتی ہوں۔“

”کیا۔“ پروین نے حیرت سے شہناز کو دیکھا۔

”اسی وقت گیٹ سے کار کے ہارن کی آواز آئی۔ شہناز نے گھوم کر دیکھا تو عجیب گھبراہٹ

ہوا سا کار سے اتر رہا تھا۔

”خیریت تو ہے مجیب صاحب۔“ شہناز نے پوچھا۔

”کیسی خیریت شہناز صاحبہ۔“ مجیب نے جواب دیا۔ ”قیصر نے غلطی سے خواب آور دوا کی گولیاں کھالی ہیں۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ شہناز چونکی۔

”سچ عرض کر رہا ہوں۔ اگرچہ ڈاکٹر نے پیٹ کی پوری صفائی کر دی ہے مگر ان کا برا حال ہے آپ کو بلا رہے ہیں۔“

”مجھے؟“

”جی ہاں۔“ مجیب نے کہا پھر رک کر پوچھا۔ ”تھکیل صاحب کا کیا حال ہے؟ انہوں نے بھی گولیاں کھائیں تھیں۔“

”تمہیں کیسے معلوم؟“ پروین نے سوال کیا۔

”جی۔۔۔ میں۔۔۔ اور قیصر صاحب وہیں موجود تھے۔۔۔ چاندنی باغ میں۔“

”ان کا تو انتقال ہو گیا۔“ شہناز بڑے غمگین لہجے میں سر جھکا کر بولی۔

”ارے مجیب اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔“

”غم تو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔“ شہناز نے پوچھا۔

”پریشان۔۔۔ میں۔۔۔ نہیں تو۔“ مجیب ہٹلایا۔ ”وہ قیصر صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔“

”کیوں؟“

”شاید کچھ معافی وغیرہ مانگنا چاہتے ہیں۔“

”تو ذرا پہلے آئے ہوتے۔ اب تو میں عدنان صاحب کو دے چکی ہوں۔“

”کیا! مجیب نے حیرت سے پوچھا۔“

”یہی معافی وغیرہ۔“

”سچ سچ۔“ پیچھے سے عدنان کی آواز آئی۔

”میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتی۔“ شہناز اس کے قریب آنے پر بولی۔

”اور شادی۔“ عدنان نے چپے سے کہا۔

”وہ بھی نہیں۔“

”دیکھ رہی ہو۔“ عدنان نے پروین سے کہا۔ ”یہ محترمہ پیچھے پیچھے میری اچھائیاں کرتی

ہیں مگر سامنے۔۔۔“

”تو آپ چل رہی ہیں نا۔“ مجیب نے اسے فقرہ پورا نہیں کرنے دیا۔

”کہاں؟“ عدنان نے پوچھا۔

”قیصر صاحب دم آخر شہناز بہن سے معافی مانگنا چاہتے ہیں۔“ پروین نے بتایا۔

”ارے تو آپ لوگ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں۔ جلدی چلئے عدنان نے شہناز کا ہاتھ

پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

سب لوگ کار میں آکر بیٹھ گئے۔ مجیب نے کار اشارت کی۔

”وہاں کمرے میں کیا گزری۔“ پروین نے راستہ میں عدنان سے پوچھا۔

”بھی کہاں گزری۔“ عدنان نے جواب دیا۔ ”البتہ جلد ہی گزرنے والی ہے۔ میرا

مطلب تھا۔“ ”پروین جلدی سے بولی کہ انکل آنٹی وغیرہ نے آپ کی گوش مالی تو نہیں

کی۔“

”انکل تو آنٹی کے سامنے بول ہی نہیں سکتے اور آنٹی خود اس ڈرامے کی ڈائریکٹر

تھیں۔ وہ کیا بولتیں۔“ عدنان نے بتایا۔ ”البتہ قبلہ والد صاحب کو جب اچھی طرح یقین

ہو گیا کہ میں ان کا تخت جگر ہوں تو کان پکڑ کر کمرے سے باہر نکال دیا اور اب وہاں مشورے

ہورہے ہیں آپس میں۔“

”مشورے؟ کس بات کے۔“ پروین نے پوچھا۔ پھر خود ہی شہناز کی طرف دیکھتے

ہوئے مسکرائی۔ ”اچھا اچھا میں سمجھ گئی۔“

”ہاں نہیں تمہاری سہیلی بھی تمہاری طرح سمجھ دار ہیں یا نہیں۔“ عدنان نے کہا۔

شہناز کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”کار قیصر کی کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ یہ لوگ اتر کر برآمدے میں آئے تو قیصر کے

والد اور کچھ دوسرے عزیز کافی پریشان سے ڈاکٹر صاحب کو گھیرے کھڑے تھے۔ ڈاکٹر کہہ

رہے تھے۔ ”میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کیا ہے۔ بظاہر تو زہر خورانی کی کوئی علامت نہیں مگر حالت گرتی جا رہی ہے بہر حال لیبارٹری کی رپورٹ کا انتظار ہے۔ وہ آجائے تو کچھ بتا سکوں گا۔“

قیصر کو اس کی خواہش پر کمرے میں اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ مجیب، شہناز، عدنان اور پردین کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ چہرے سے برسوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ شہناز کو دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

”ارے۔ ارے آپ کیوں لیٹنے کی زحمت کر رہے ہیں۔“ عدنان نے جلدی سے کہا۔
”بیٹھے رہیے۔“
قیصر لیٹ گیا۔

”میں نے عرض کیا تھا بیٹھے رہیے۔“ عدنان بولا۔
”یہ کون ہیں؟“ قیصر نے عدنان کو گھورتے ہوئے شہناز سے پوچھا۔
”جی، مجھے عدنان کہتے ہیں۔“

”میں نے تو تم سے صرف شہناز کو لانے کے لیے کہا تھا۔“ قیصر نے مجیب کو گھورا۔
”میں ابھی آیا۔“ مجیب جواب دہی سے بچنے کے لیے باہر چلا گیا۔
”معاف کیجئے میں اپنی ہونے والی بیوی کو تنہا آنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔“
عدنان نے کہا۔

”بیوی۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔“ قیصر ہکا کر رہ گیا۔
”یعنی کہ والف۔ یعنی کہ رفیقہ حیات یعنی کہ نصف بہتر یعنی کہ شہناز جی ہاں۔“
عدنان نے جواب دیا۔

”تقدیر میں یہی لکھا تھا قیصر بھائی۔ میں کیا کرتی۔“ شہناز نے سر جھکا کر کہا۔
”مگر تم تو ٹھیک کو پسند کرتی ہو۔“
”ٹھیک صاحب میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے گئے ہیں۔“
”تو کیا وہ مر گیا؟“

”جی نہیں صرف انتقال کر گئے ہیں۔“ شہناز نے آہستہ سے کہا۔
 ”اور میں اس سے معافی بھی نہیں مانگ سکا۔“ قیصر بڑبڑایا۔
 ”مگر وہ آپ کے مانگے بغیر دے گئے ہیں۔“ عدنان نے بتایا۔ ”کہہ رہے تھے کہ پہلی
 فرصت میں قیصر صاحب کو پہنچا دیا جائے۔“
 ”کیا؟“

”یہ بڑوہ۔“ عدنان نے ایک پرس جیب سے نکال کر قیصر کی طرف بڑھا دیا۔
 ”یہ تو میرا بڑا ہے۔“

”جی ہاں کھلیل صاحب بتا رہے تھے کہ داخلے والے دن انہیں آپ کی جیب میں پڑا
 ملا تھا۔ کھولا تو تین سو روپیہ نکلے۔ ڈیڑھ سو روپے آپ ان سے قرض لے چکے تھے۔ اس
 لیے وہ انہوں نے وصول کر کے ڈیڑھ سو آپ کو واپس کر دیے تھے۔“

”اوہ!“ قیصر اس طرح آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہو۔
 ”اور وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ آپ کو انا لگا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے
 اپنی بات جاری رکھی۔ ”کیونکہ جو ڈراما اب تک کھیلا گیا اس میں شروع سے آخر تک نقلی
 گولیوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ پروین صاحبہ نے محض شہناز کو ستانے کے لیے جھوٹ بولا
 تھا اور آپ کی لائی ہوئی گولیاں پہلے ہی گٹر کی زینت بن چکی تھیں۔“

”کیا؟“ قیصر اچھل پڑا۔ ”گویا میں نے جو گولیاں کھائی تھیں وہ اصلی نہیں تھیں۔“

”کی ہاں! بس غلطی ہو گئی اصل ہونا چاہیے تھیں مگر نہیں تھیں۔“

”پھر میں مر کیوں رہا ہوں۔“ قیصر نے بوکھلا کر کہا۔

”اے آپ کی سعادت مندی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔“ عدنان نے جواب دیا۔

”مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ پھر وہ کھلیل کیسے مر گیا۔“

”میں نے بتایا نا کہ صرف انتقال فرمایا ہے۔“ شہناز نے کہا۔

”بات تو ایک ہی ہوئی۔“

”نہیں ہوئی نا۔“ شہناز جیسے افسردگی کے ساتھ بولی۔ ”انتقال کے لغوی معنی ہیں ایک

جگہ سے دوسری جگہ جانا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ کلیل سے عدنان۔ عدنان سے کلیل۔ پھر کلیل سے عدنان اور عدنان سے کلیل۔“ عدنان نے بتایا۔

”میں کچھ نہیں سمجھا۔“ قیصر نے حیرت سے کہا۔ ”کلیل سے عدنان۔ عدنان سے کلیل۔“

”بس اس طرح پندرہ منٹ تک کہتے رہے۔ خود بخود سمجھ جائیں گے۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“

”لاحول ولا قوۃ“ اب میں سالوں سے مذاق کروں گا۔“

قیصر اب بھی ہنچکا رہا تھا۔

”ہمارے سامنے شرم آتی ہو تو ہم باہر چلے جاتے ہیں۔“ عدنان نے کہا۔ ”آؤ بھی شہناز۔ پروین تم بھی آجاؤ۔“

وہ تینوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ قیصر شاید اس وقت نفسیاتی طور پر بوکھلایا ہوا تھا کہ اس نے سچ کچھ کرا خالی ہوتے ہی کلیل سے عدنان اور عدنان سے کلیل کا ورد شروع کر دیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد مجیب نے کمرے میں جھانکا۔

”یہ کیا کر رہے ہو۔“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”میں دس منٹ سے لگا ہوا ہوں اور اب تک سمجھ میں نہیں آیا، تم تو ابھی آئے ہو۔“ قیصر نے رسد و اچ دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”بس پانچ منٹ باقی ہیں۔ پھر پتا چل جائے گا۔ تم سمجھنا چاہتے ہو تو آؤ تم بھی شروع ہو جاؤ۔ کلیل سے عدنان سے کلیل۔ کلیل سے عدنان۔ عدنان سے کلیل۔“

”مجبیب نے گھبرا کر قیصر کی طرف دیکھا اور اپنا سر ہلانے لگا۔“

ختم شد